ہم دعوت کا کام کیسے کریں؟

عبدالبدیع صقر

ترتیب وترویں

مولانا مفتی محمد ایاز

اشاعت اکیڈمی

عبدالغنی پلازہ محلہ جنگی پشاور 091-2580325 091-2590315

ہم دعوت کا کام کیسے کریں

ابو معاویہ مولانا مفتی محمد ایاز حفظہ اللہ

العلم پبلیکیشنز محلہ جنگی پشاور
091-2590315

فہرست مضامین

- پیش لفظ 11
- داعی کے اوصاف اور طریقہ کار 12

باب:۱

دعوت کی فضیلت اور اس کا حکم 16

- دعوت کے کام کا حکم الٰہی 16
- طریقۂ دعوت 21
- امت کا ہر فرد داعی بن جائے 23
- داعی اور دعوت کے فضائل 23
- داعی کا عظیم درجہ 26
- داعی کا ثواب 27
- قابل رشک داعی 28
- داعی کے لیے سب سے بڑا اعزاز 28

باب:۲

داعی اور دعوت 32

- داعی کی تعریف 32
- رسولوں کا کام دعوت الی اللہ 33
- دعوت الی اللہ میں امت کی شرکت 34
- دعوت الی اللہ کا مکلّف کون؟ 36
- شبہات واعتراضات 39
- وجوب دعوت الی اللہ کی وجوہات 49
- فریضۂ شہادتِ حق 50
- کفر کا غلبہ اور اس کے اثرات 51
- ہلاکت اور عذاب سے بچاؤ 52

- داعی کی حالت وقدرت اور دعوت الی اللہ 53
- ہر وقت اور ہر حال میں دعوت 56
- داعی کی اصل ذمہ داری 58
- اللہ کی طرف مسلسل دعوت 59
- داعی کا اجر اللہ پر ہے نہ کہ بندوں پر 60
- اسلام میں داعی کا مقام 61
- منظّم دعوت 63
- ذاتی انہماک 65
- بصیرت وعلم 65
- دوست مزاج 66
- انتظامی صلاحیت 66
- تربیت یافتہ 66

باب:۳

زادالمبلغ 67

- تقویٰ کیا ہے؟ 68
- داعی کی پہلی صفت 69
- جاہل اور جاہل مرکب میں فرق 69
- تین کاموں میں بصیرت ہونی لازمی ہے 70
- علم کے بغیر دعوت 72
- داعی کی دوسری صفت 73
- داعی کی تیسری صفت 81
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے چند نمونے 84
- داعی کی چوتھی صفت 88
- داعی کی پانچویں صفت 89
- داعی کی چھٹی صفت 90

باب:۴

داعیانہ کردار کے آداب 94

- دعوت و تبلیغ کے آداب 107
- نظم جماعت کے آداب 118
- قیادت کے آداب 122

باب:۵

داعی اور کارکن کیسے ہوں 128

- کتاب وسنت کا قانون 129
- کتاب وسنت کا علم 131
- اپنا تزکیہ 132
- ہمیشہ جیب میں چھوٹا قرآن مجید رکھیں 132
- اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی صفت پیدا کریں 133
- اَلْوَلَاء وَالْبَرَاء کی صفت سے ہم محروم کیوں 134
- رھبان باللیل وفرسان بالنہار کا ماحول بنائیں 137
- نعروں کی سیاست 141
- ایک جماعت اور امیر 143

باب:٦

دعوت کی ناکامی کے اسباب 145

- دعوت کی ناکامی کے اسباب 146
- کامیابی کی شرائط 148
- کامیابی کی کلید 150
- دعوت کا انداز 151

باب:۷

انفرادی دعوت 155

- مفہوم 155
- خصوصیات 155
- اثرات 157
- دعوت کے آداب 157
- حلم وبردباری 158
- مخاطب کے جذبات کا احترام 159
- حالات کا مطالعہ 159
- بنیادی اصولوں پر توجہ 160
- اعترافِ حق 161
- متفقہ امور میں باہمی تعاون 161
- حرص سے پرہیز 162

باب:۸

اجتماعی دعوت 163

- حقیقت واہمیت 163
- عبادتی امور سے متعلق خطبے 166
- شرعی تقریروں میں قابل لحاظ امور 166
- موثر خطبے 167
- عوامی دعوت کے آداب 168

باب:۹

دعوت کتابوں سے 195

- تصنیف وتالیف 195
- موجودہ مذہبی کتابوں کی خامیاں 196
- داعی اور تصنیف وتالیف 197

- صحافت 198
- تنقید 200
- رسائل وخطوط 202
- علمی و تحقیقی رسالے 204
- ٹیپ ریکارڈنگ 205

باب:۱۰

داعی کا کردار 206

- داعی کا کردار 206
- پاکیزگی اور ایثار 208
- فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی 209
- قربانی اور اس کی متعدد شکلیں 210
- نیکوکاروں سے تعلق 211
- دینی تربیت کا فن 213
- عربی زبان کا اہتمام 216
- اجتماعی کاموں کی اہمیت 217
- فلاحی اداروں کا قیام 219
- ازدواجی اور معاشرتی آداب 220
- کردار کی اثر آفرینی کے کچھ نمونے 221

باب:۱۱

ابلاغِ دعوت کے وسائل 226

- قول (زبان) کے ذریعے ابلاغ دعوت 226
- ابلاغ دعوت میں قول کی اہمیت 226
- گفتگو کے عمومی آداب 227
- داعی کے لیے گفتگو کے آداب 229
- گفتگو کی قسمیں 233

خطاب	233
درس	237
لیکچر	238
مباحثہ ومناظرہ	240
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	242
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قواعد	243
علم	243
نرمی	243
مصلحتوں پر نظر	245
معروف اور منکر کا ملاپ	246
ابلاغ بقدر امکان	246
خط وکتابت اور تحریر	247
عمل کے ساتھ ابلاغ دعوت	248
عمل سے مراد	248
منکر کو ختم کرنے کی بنیاد	248
منکر کا ازالہ کرنے کے عمومی قواعد	249
ازالہ منکر کی قدرت	250
منکر سے نفرت اور اس کا ازالہ بقدرِ وسعت	251
ازالۂ منکر کے لیے مباح اُمور کا سہارا لینا	252
اچھے کردار سے ابلاغ دعوت	252
اچھے کردار کی اہمیت	252
اچھے کردار کے اصول	254
اچھے اخلاق	254
قول وفعل میں مطابقت	256

باب:۱۲

عام معاملات 257

- سوالات وجوابات 257
- عادات اور احکام سے متعلق سوالات 257
- سیاست سے متعلق سوالات 259
- دعوت کے کام سے متعلق چند سوالات 265
- مغربی افکار سے متعلق مسائل 268
- ظاہر و باطن 269
- وسیلہ اور شفاعت 271
- معاشی بدحالی انسانی مسائل کی واحد وجہ ہے؟ 272
- اجتماعات کا قیام 273
- دعوت کی قسمیں 274
- دعوت کے اعلان کا طریقہ کار 274
- اجتماع گاہ 275
- جلسہ گاہ کی نگرانی داخلی اور خارجی طور سے 276
- اجتماع کے بعد 276
- دعوتی ادارے 276
- استعماریت کے نشانات 279
- سامراجیت کی ناکامی 282
- حکومتی سطح پر دعوت و تبلیغ کا اہتمام 283
- حرف آخر 283

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور عبادت ہر موقع پر ہمہ وقتی بندگی اور اطاعت کا نام ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی یہی دعوت تھی کہ اے لوگو! اللہ کی ہمہ وقتی بندگی اختیار کرو اور غیر اللہ کی بندگی چھوڑ دو۔ جب سے انسان دنیا میں آیا تو ہمیشہ سے یہی دعوت و تبلیغ کا کام ہوتا رہا ہے۔ اس عالم کارنگ وبو وجود میں آتے ہی داعیوں ومربیوں کا سلسلہ اس کے ساتھ جزولاینفک کی طرح جڑا ہوا اور قائم ودائم چلا آرہا ہے اور یہ سلسلہ اس فانی دنیا کے خاتمے تک جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے لے کر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل تک ہر دور میں مختلف علاقوں میں اپنے داعی پیغمبروں کی شکل میں بھیجے تاکہ وہ دنیا والوں کو ان کی زندگی کا مقصد اور دنیا میں رہنے کے لائحہ عمل کی یاد دہانی کرواتے رہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دنیا والوں کے لئے سب سے پہلے داعی سیدنا آدم علیہ السلام اور آخری داعی سیدنا محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد دعوتِ انبیائے علیہم السلام کا یہ فریضہ امتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا گیا ہے اور اب یہی ان کے وارث ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

اَلْعُلَمَاءُ هُمْ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلاَ دِرْهَمًا، إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔ [ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی]

"علمائے کرام انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام میراث میں درہم ودینار نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کی میراث علم ہوتا ہے، جس نے اس میراث میں سے حصہ پایا، یقیناً بہت ہی بڑا حصہ پایا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی تیار کردہ داعی جماعت دعوت وجہاد کا علَم اٹھا کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ اس طرح انہوں نے پوری دنیا میں جہاد کے ساتھ

دعوت الی اللہ کے فریضے کا حق یوں ادا کیا جیسے اسے ادا کرنے کا حق تھا۔ دیکھئے پھر نتیجہ کیا نکلا؟ دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کا پرچم چہار دانگِ عالم پر چھا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی قدوسی جماعت کے بعد بھی امت میں اس مقصد کے لئے انفرادی واجتماعی طور پر جدوجہد ہوتی رہی اور آج بھی یہ جدوجہد امت میں جاری وساری ہے۔

الغرض داعی ہمیشہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی لاتا ہے جو قوموں کو عروج پر لے جاتی ہے اور ان کو عزت ووقار کے ساتھ جینا سکھاتی ہے۔ داعی دراصل انقلابی ہوتا ہے جس کی دعوت سے معاشرہ اور لوگوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور اُن میں ایک ایسی روح پھونک دیتا ہے جو ان کو خوشی اور رغبت سے عمل کرنے اور قربانی دینے پر آمادہ کرتی ہے۔

داعی معاشرے کو شرک وبدعات اور خرافات سے بچاتا ہے۔ وہ عائلی اور سیاسی زندگی میں بھی عامۃ الناس کا رہنما ہوتا ہے۔ وہ امت کی صحیح راہنمائی کرکے کفر والحاد کی یلغار جو کہ یہود ونصاریٰ اور ہنود کی طرف سے جاری ہے۔ ان الحادی آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور لائحہ عمل فراہم کرتا ہے اور خود بھی اس کے خلاف لڑتا ہے۔ وہ حرص مال وجاہ، کشش سیم وزر، اولاد، خاندان کی غافلانہ فضاؤں، بینک بیلنس کے چکروں اور دنیا کے بھیندے میں پھنس جانے والے انسانوں کو معاش کے ساتھ ساتھ معاد کی یاد دہانی بھی کرواتا ہے، کیونکہ اس کو اپنی عمر، جوانی، مال ودولت کی فراوانی کے ذرہ ذرہ اور لحہ لحہ کا حساب دینا پڑے گا۔

"یوں داعی امت کے افراد کو یہ سبق بھی دیتا ہے کہ معاش کو ہی سب کچھ نہ سمجھو یہ تو صرف زندگی گزارنے کا ایک ادنیٰ سا ذریعہ ہے نہ کہ مقصد، مقصد تو اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی، دعوت دین، اقامت دین اور آخرت کی جواب دہی ہے"۔

داعی کے اوصاف اور طریقہ کار:

دعوت دین اور داعی کا کام اور محنت صرف اُسی وقت مفید اور موثر ثابت ہو سکتا ہے جب:

(۱) دعوتِ انبیاء علیہم السلام کے نہج پر ہو۔

(۲) دعوت کے آداب واحکامات کو ملحوظ رکھا جائے اور اصول کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

(۳) داعی میں مخلوق خدا کے ساتھ احسان اور خیر خواہی کا جذبہ اور اخلاص ہو۔

(۴) داعی میں دعوتِ حق کی فکر اور درد ہو۔

(۵) داعی میں احساس ذمہ داری ہو۔

(۷) داعی طریقہ دعوت اور ہر موقع محل کی مناسبت سے بات کرنا جانتا ہو۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ دعوت صرف تقریر کرنے کو نہیں کہا جاتا اور نہ داعی صرف مقرر اور خطیب ہوتا ہے جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صرف تقریر کرکے یا درس دے کر دعوت کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتے ہیں۔

داعی اور خطیب و مقرر میں بڑا فرق ہے۔ اکثر مقررین اور خطباء بس محض مقررین وخطباء ہی ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لیکن داعی ایک فکر کا علمبردار ہوتا ہے اور اسی کی طرف خطابت، تحریر، عوامی گفتگو، اپنی خاص وعام زندگی کے نفع بخش اعمال اور تمام پروپیگنڈہ وسائل کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ بہ یک وقت مصنف اور مضمون نگار بھی ہوتا ہے تو خطیب بھی ہوتا ہے، عوامی گفتگوئیں بھی کرتا ہے اور کردار کا نمونہ بھی پیش کرتا ہے وہ اپنے کام اور شخصیت سے لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ سوسائٹی کے فاسدانہ نظام اور طریقہ کار کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ ایک سوشل ڈاکٹر ہوتا ہے جو دلوں کے روحانی امراض کا علاج کرتا ہے چنانچہ وہ تنقید بھی کرتا ہے اور جائزہ بھی لیتا ہے۔ اس کی زندگی اصلاح ہوتی ہے، وہ ایک اچھا ساتھی اور دوست ہوتا ہے، امیر وغریب سب کا بھائی ہوتا ہے، چھوٹے بڑے ہر ایک سے شفقت واحترام کا معاملہ کرتا ہے، انہی صفات کی وجہ سے ہم اس کے دل میں محبت کا دریا موجزن دیکھتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے رحمت وشفقت جھلک رہی ہوتی ہے، اس کی زبان زخمی دلوں پر پھایا رکھتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے ہاتھ کمزوروں کے لئے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ داعی اپنے دائرے میں قائد ہوتا ہے، اپنے ماحول میں سیاست داں ہوتا ہے، اپنی فکر کا لیڈر ہوتا ہے اور اس فکر کے علمبرداروں کی رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ ساری صفات تنہا خطابت کے حقوق ادا کرنے سے پیدا نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کے لیے اندرونی تاثیر چاہیے، روحانی کمال چاہیے، خدا سے مضبوط تعلق ہونا چاہیے اور تاریخ کے تجربات اور

لوگوں کے حالات سے عقل کا استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح داعی کے لیے تربیت شدہ ہونا اور اس کی دعوت منظم طریقے پر ہونا بھی ایک لازمی امر ہے۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں دعوت کی فضیلت اور اہمیت کے ساتھ ساتھ دعوت کے اصول و قواعد کہ دعوت کا کام کیسے کیا جائے ، اور دوسری کتاب تربیت ارکان اور نظم جماعت پر لکھی جائے۔ مؤخر الذکر موضوع اتنا وسیع اور مشکل ہے کہ اس کے لئے بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے اور مختلف تجربات کا نچوڑ پیش کرنا ہوتا ہے ، لیکن بالآخر مسلسل تصنیفی ،تدریسی اور تنظیمی مصروفیات کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''نظم جماعت اور تربیت ارکان کیا، کیوں اور کیسے ؟'' نامی کتاب پر کام بفضل تعالیٰ مکمل ہو گیا ہے، جبکہ دعوت کی اہمیت اور طریقہ کار پر خود لکھنے کا ارادہ اُس وقت ترک کر دیا جب عالم عرب کے مشہور سکالر الشیخ عبد البدیع صقر مصری صاحب کی عربی کتاب ''کَیْفَ نَدْعُوا النَّاسَ'' ہاتھ لگی جو اس موضوع پر کافی حد تک مفید ہے۔ بعد میں اسی کتاب کا اُردو ترجمہ جاوید احسن فلاحی صاحب علی گڑھ نے ''ہم دعوت کا کام کیسے کریں؟'' کے نام پر کیا تھا۔ ہندوستان پبلی کیشنز دہلی کا ۱۹۸۲ء کا طبع شدہ ایک ساتھی کے ذریعے مل گیا۔ پھر دار البلاغ پبلشرز لاہور والوں کی ۲۰۰۱ء میں مطبوعہ یہی کتاب کچھ اضافی عنوانات کے ساتھ شائع کردہ اسی نام سے مل گئی۔

میں نے بھی اس اُردو ترجمہ کو جدید ترتیب کے ساتھ ، دار البلاغ والوں کی بعض غیر ضروری اضافہ شدہ عنوانات کو حذف کرکے ابتداء میں اپنا لکھا ہوا مقدمہ اور مولانا یوسف اصلاحی کا ''داعیانہ کردار کے آداب'' کے عنوان کا اضافہ کرکے شائع کرنے کا عندیہ اشاعت اکیڈمی کے ڈائریکٹر برادر نسبتی مولانا حشمت علی صافی صاحب کو دیا جو یقیناً اس بات میں بڑے مخلص اور فکر رکھنے والے ہیں۔ انہوں نے بخوشی اس کام کو کرنے کی حامی بھری۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرمائیے۔ آمین

اب کتاب کی ترتیب جدید یہ ہو گی:

☆ پیش لفظ	از بندہ ابو معاویہ محمد ایاز
☆ دعوت کا حکم اور اس کے فضائل	از محمد طاہر نقاش
☆ داعی اور دعوت	از عبد الکریم زیدان
☆ زاد المبلغ	از شیخ محمد بن صالح العثیمین
☆ داعیانہ کردار کے آداب	از مولانا یوسف اصلاحی
☆ دعوت وجہاد کے داعی اور کارکن کیسے ہوں؟	از مولانا محمد شریف مدینہ یونیورسٹی
☆ دعوت کی ناکامی کے اسباب تا آخر کتاب	از شیخ عبد البدیع صقر

آخر میں داعیان امت سے گزارش ہے کہ اس کتاب کو خود بھی غور اور فکر سے مطالعہ کریں اور دوسرے داعی حضرات کو بھی اس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دلائیں۔ ان شاء اللہ یہ کتاب دعوت کے کام میں آپ کے لئے بے حد مفید ثابت ہو گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح اور منظم دعوت کی توفیق اور فکر عطاء فرمائے۔ آمین

أَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا أَسْتَغْفِرُ اللهَ لِيْ وَلَكُمْ لِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ آمین

ابو معاویہ محمد ایاز درانی

جامعہ تبلیغ القرآن یوسف آباد پشاور شہر

باب:۱

دعوت کی فضیلت اور اس کا حکم

موجودہ دور میں جب سے عالم کفر خاص طور پر ہنود و یہود اور صلیبیوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں اسلام کے خلاف مختلف نت نئے رنگوں میں سامنے آرہی ہیں۔ ٹی وی، وی سی آر اور ڈش کے بعد اب کیبل سسٹم اور سی ڈیز کا طوفان ہر مسلمان گھرانے اور خاندان میں گھس چکا ہے۔ ہر مسلم گھرانہ کافروں کا نشانہ ہے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح اخلاقی ومذہبی اعتبار سے برباد کر دیا جائے۔ تو ایسے حالات میں داعیانِ اسلام کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور پہلے سے مصروف داعیوں کو زیادہ تیزی اور تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ امت مسلمہ کو اگر اس سیلاب اور طوفان سے نہ بچایا گیا تو وہ خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق بن جائے گی۔ اس لیے دعوتی نیٹ ورک کو وسیع پیمانے پر پھیلانا بہت بڑے اجر وثواب اور نجات کا یقینی ذریعہ ہے۔ اللہ کریم اور اس کے پیارے رسول نے بھی دعوت الی اللہ کی فضیلت اور فرضیت کی طرف متعدد مقامات پر واضح طور پر احکامات صادر فرمائے ہیں۔

دعوت کے کام کا حکم الٰہی:

ایک مقام ذی شان پر اللہ الرحمٰن داعیوں اور مبلغین کی جماعت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ [آلعمران: ۱۰۴/۳]

" اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے دعوت کے کام کی اہمیت کو واضح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں، (نیکی) بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے"۔

اسی سورت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ دعوت دین کا کام کرنے والوں کو لوگوں میں سے بہترین اور پسندیدہ گروہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اے مسلمانوں! تم وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے کہ تم ضرور نیکی کی دعوت دیتے رہنا اور ضرور برائی سے روکتے رہنا ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر تم اس سے دعائیں کرو لیکن وہ قبول نہ ہوں"۔

[ترمذی، کتاب الفتن: باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا: "تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے (یعنی بزور قوت) اسے روک دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ہی (منع کرکے وعظ و نصیحت کرکے ہی اس کی اصلاح کی کوشش کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر دل ہی سے (اسے برا جانے) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے"۔

[صحیح مسلم، کتاب الایمان: باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان]

اس بات کی تائید رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے، فرمایا: "جب لوگ ظالم کو ظلم کرتا دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ

(ظالموں پر نازل کیے جانے والے) عذاب کو عام کرکے (ان ظلم سے) نہ روکنے والوں کو بھی اس کی لپیٹ میں لے لے"۔ [سنن ابی داؤد: کتاب الملاحم، ترمذی: کتاب الفتن]

سورہ اعراف کی ابتداء میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"یہ ایک کتاب ہے جو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ پس تمہارے دل میں اس کے متعلق کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (منکرین حق کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دھانی دو"۔

اس آیت مبارکہ میں جھجک سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی کتاب "قرآن" (کے احکام) کو بغیر جھجک اور لومة لائم اور کسی قسم کے خوف سے ماورا ہو کر لوگوں تک پہنچاؤ اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو کہ مخالفین اس کا کس طرح اور کس انداز میں استقبال کریں گے۔

کفر وشرک اور بدعات وبداعمالیوں کو اختیار کرنے والے درحقیقت اہل دنیا کی ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ خود تو ان معصیتوں اور اللہ کریم کی نافرمانیوں کا باعث بن کر ہلاکت کا باعث بنتے ہی ہیں، لیکن ساتھ ہی دوسرے لوگوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں کہ جو ان کی بداعمالیوں اور کفر وشرک کی روش پر خاموشی کی چادر تانے سوئے رہتے ہیں اور نہی عن المنکر کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش نہیں دیتے۔ ان کو طاقت اور بزور قوت روکنا تو دور کی بات ہے۔

اسی بات کی نشان دہی کرتے ہوئے سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم رہنے والے اور ان کو توڑ دینے والے کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جنہوں نے قرعہ اندازی کرکے ایک کشتی کے حصے آپس میں تقسیم کر لیے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو کشتی کا نچلا حصہ ملا جبکہ دوسرے گروہ کو اوپر والا حصہ ملا۔ جو لوگ کشتی کے نیچے والے حصے میں تھے ان کو جب پانی کی ضرورت پڑتی تو انہیں اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا (انہوں نے سوچا کہ یوں ہمارے پانی لینے کے لیے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے) پس وہ کہنے لگے: (کیوں نہ) اگر ہم کشتی کے اپنے حصے میں سوراخ کر لیں (اور

اس سوراخ میں سے پانی لے لیا کریں اور بار بار اوپر جا کر) اوپر والوں کو (بے جا) تکلیف نہ پہنچائیں (تو یہ نہایت اچھا ہوگا) اب اگر اوپر والے انہیں (ایسا کرنے سے نہ روکیں گے اور انہیں) اپنے حال پر چھوڑ دیں گے کہ وہ اپنا یہ (خطرناک اور ہلاکت خیز) ارادہ پورا کر لیں تو (اس سوراخ کے ذریعہ پانی کشتی میں بھر جائے گا اور اسے ڈبو کر غرق کر دے گا اور پھر) سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے لیکن اگر اوپر والے ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے (اور انہیں کشتی میں سوراخ کرنے سے روک دیں گے) تو خود بھی بچ جائیں گے اور باقی تمام لوگ بھی نجات پا جائیں گے"۔

[صحیح بخاری: کتاب الشھادات]

اور جو داعی گناہگاروں کو دعوت بھی دیتے ہیں لیکن بد عملی سستی کوتاہی اور بعض سیاسی مصلحتوں کو آڑ بنا کر پھر ان کے ساتھ شریک سفر بھی رہتے ہیں، ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ بھی بنتے ہیں، ان دورخی داعیوں اور لوگوں کے متعلق رسول اللہ کی یہ وعید سن لیں:

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم سے پہلے بنی اسرائیل میں جب کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا تو منع کرنے والا (داعی) اسے منع کرتے ہوئے تنبیہ کرتا لیکن دوسرے دن بلا جھجک اسی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا، گویا اس نے اسے کل گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہی نہ تھا۔ جب وہ لوگ یہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک جیسا کر دیا اور سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم ضرور نیکیوں کا حکم دو، برائی سے روکو، گناہ کرنے والوں کے ہاتھ کو پکڑو اور انہیں حق پر قائم رکھو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو ایک جیسا کر دے گا اور تم پر بھی لعنت کرے گا جیسے ان لوگوں پر کی"۔ [مجمع الزوائد: ۲۶۹/۷]

داعی اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف دعوت دیتے ہوئے اپنے علمی سرمایہ کو حقیر اور معمولی نہ سمجھے۔ چنانچہ اس تک جو بات پہنچے اسے دوسروں تک پہنچانا چاہیے خواہ کتاب اللہ کی ایک آیت ہی ہو۔ اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو

دیتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"میری طرف سے پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو"۔

[بخاری: کتاب احادیث الانبیاء]

ایک دوسرے مقام پر رسول اللہ نے داعی کے لیے کہ جو لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت کے راستے پر ڈالتا ہے، یوں دعائے خیر فرمائی ہے:

" اللہ اس شخص کو شاداں وفرحاں رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے اور اُسی طرح دوسروں تک پہنچادے کہ جیسی سنی تھی۔ بسا اوقات جس شخص کو بات پہنچائی جاتی ہے وہ اس بات کا سننے والے سے زیادہ محافظ ہوتا ہے۔" [سنن ترمذی: کتاب العلم]

داعی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داعیانہ تعلیمات مسلمانوں میں باطل کے مقابلہ میں جرأت، بہادری، شجاعت اور دلیری وجوانمردی کی روح پھونکتی ہیں اور ان کو یہ اطمینان دلاتی ہیں کہ ظالموں کے مقابلہ میں ان کی اس دلیری وشجاعت اور قول حق سے نہ تو ان کے رزق میں کمی آئے گی اور کلمہ حق کہنے کے نتیجے میں نہ ہی ان کی موت وقت سے پہلے آئے گی بلکہ موت تو اس وقت ہی آئے گی جب اس کے آنے کا وقت لوح محفوظ میں لکھا گیا، اس میں نہ کوئی ایک لمحہ مؤخر کر سکتا ہے اور نہ مقدم۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

" لوگوں کا خوف کسی کو حق بات کہنے یا حاکم وقت کو اس کے غلط فعل (اور فیصلے) پر ٹوکنے سے ہر گز مانع نہ ہو۔ کیونکہ وہ نہ تو اسے وقت سے پہلے موت دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے رزق سے محروم کر سکتا ہے"۔ [مسند احمد: ۵۰/۳، ابن ماجہ: کتاب الفتن]

داعیوں کی یہ جماعت دعوت کا کون سا اسلوب اختیار کرے، دعوت کس طرح دے؟ اس بات کی وضاحت فرماتے ہوئے اللہ مالک الملک نے قرآن حکیم میں ہی ایک دوسری جگہ دعوتِ دین کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

[النحل: ۱۲۵/۱۶]

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! لوگوں کو حکمت و دانش اور نیک نصیحت کے ساتھ اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان کے ساتھ مناظرہ کرو"۔

قرآن پاک میں ایک تیسرے مقام پر رب العالمین طریق دعوت کو بیان کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا حکم یوں دیتے ہیں:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔[یوسف: ۱۰۸/۱۲]

" کہہ دو میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں رب تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں سوچ سمجھ کر بصیرت کے ساتھ ۔ میں بھی لوگوں کو الٰہ واحد کی طرف بلاتا ہوں اور میری تابعداری اور فرمانبرداری کرنے والے اصحاب بھی۔"

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں واضح طور پر حکم دیا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے کی طرف گم گشتہ راہوں بھٹکے ہوؤں کو دعوت دی جائے۔

طریقۂ دعوت:

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی فرد، گروہ یا جماعت حق پر ہوتی ہے، سچی ہوتی ہے تو اس کو یہ فخر اور مان ہوتا ہے کہ ہمیں کیا! ہم تو حق پر ہیں۔ ہمیں کسی کی کیا پرواہ! جس نے ماننا ہے وہ مان لے گا اور جس کی قسمت ہی خراب ہے اس کے دل پر مہر لگ چکی ہے وہ نہ مانے گا وغیرہ۔ اس وقت ان کا لہجہ گفتگو کا انداز نہایت خشک اور روکھا ہو جاتا ہے اور وہ اسی گمان میں لوگوں کو قدرے سخت درشت اور مفتیانہ انداز میں دعوت دیتے ہیں۔ اسی بات کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے دعوت کے اسلوب کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایسا رویہ ہر گز روا نہیں رکھنا، بلکہ اللہ کریم کے رستے کی طرف بڑے پیار محبت والے انداز میں حکمت ودانائی کے ساتھ، ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز میں، حکمت وتدبیر کے ساتھ بصیرت ودانشمندی کے ساتھ، نرم لہجے میں دعوت دینی ہے، ایسے پیار محبت بھرے انداز میں کہ جو مخاطب کے دل ودماغ میں اترتی چلی جائے۔ غلط اور ترش رو، جارحانہ، مخالفانہ، مناظرانہ اور زچ کرنے والے انداز میں دعوت دینے کا یہ نقصان ہوگا کہ مخاطب ماننے اور قائل ہونے کے بجائے مزید ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دے گا: "میں نہیں مانتا، اپنی دعوت اپنے پاس رکھیں، میں

جس راستے پر لگا ہوا ہوں وہی ٹھیک ہے"۔

یہ نتیجہ ہوتا ہے غلط انداز دعوت کا۔ اگرچہ دعوت حق پر مبنی ہوتی ہے لیکن انداز بدل جاتا ہے۔۔۔الفاظ بدل جاتے ہیں۔۔۔اور پھر نتائج بھی بدل جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہیں کہ بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن مخاطب تک پہنچانے کے لیے جو الفاظ چنے جاتے ہیں اور جس لب ولہجہ کا سہارا لیا جاتا ہے وہ مختلف ہوتے ہیں، دوسری بات یہ کہ مضمون کی ترجمانی کرنے والے الفاظ مخاطب کے تن بدن میں آگ بھی لگا دیتے ہیں اور اس کو جارحیت پر ابھارتے ہیں جبکہ اسی بات اور مضمون کو اگر الفاظ بدل کر دوسرے انداز میں ادا کیا جائے تو مخاطب نہ صرف یہ کہ متاثر ہوتا ہے، ممنون ہوتا ہے، عزت کرتا ہے، اپنے ہاں گھر دفتر یا مسجد ومکتب میں آنے کی دعوت دیتا ہے بلکہ اپنے پاس سے اظہارِ محبت کے لئے کچھ کھلانے پلانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ یہ اب داعی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ گفتگو اور دعوت کا کونسا اسلوب اور طریقہ اختیار کرتا ہے! دوسرے کو بے بس ولاجواب کرنے والا مناظرانہ وتحکمانہ انداز یا اس کو اپنا بنانے کے لئے پیار ومحبت والا حکیمانہ، ناصحانہ وخیر خواہانہ انداز۔

اللہ کریم نے خود اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ کے لئے نرم مزاج اختیار کرنے اور سختی کو ترک کر دینے کا حکم دیتے ہوئے اور سخت مزاجی کی مضرت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔ [آل عمران: ۱۵۹/۳]

"اے رسول! یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ تو ان پر (یعنی مسلمانوں پر) نرم دل ہے اگر کہیں تو اکھڑ مزاج اور سخت دل ہوتا تو تیرے پاس (ایک آدمی نہ بھٹکتا سب لوگ تیرے پاس) سے تتر بتر ہو جاتے (بھاگ جاتے)"۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے دعوت دینے کا سلوب بیان کرتے ہوئے نرم خوئی کا تذکرہ یوں فرمایا: فَقُوْلَا قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ [طٰہٰ: ۴۴/۲۰]

"تم دونوں اس سے نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ غور کرے یا ڈر جائے۔"

امت کا ہر فرد داعی بن جائے:

داعی کی مثال کسی نے کیا خوب "کسان" سے دی ہے۔ داعی اور دعوت دین کے تعلق کو اس تعلق سے تشبیہہ دی ہے جو کسان اور اس کے کھیت کے درمیان ہوتا ہے۔ کہ کس طرح وہ دانہ بونے سے لے کر فصل کاٹ کر محفوظ کر لینے تک مسلسل اور متواتر مشقت کرتا رہتا ہے اور ہر آن ہوشیار وچوکنا رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے کسی مرحلے میں بھی غفلت برتی تو میری فصل برباد ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ جب فصل پوری پک چکی ہوتی ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہوشیاری کا ثبوت دیتا ہے کہ کہیں کوئی حاسد اور دشمن و فتنہ پرور آکر اس کو آگ نہ لگا جائے یا مویشی و جانور ہی آکر اسے برباد نہ کر جائیں۔ جب تک اس کی فصل کٹ کر محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتی اسے چین نہیں آتا۔ یہی حال داعی کا ہوتا ہے کہ وہ جن افراد کی تربیت کر رہا ہوتا ہے ان کی ہر حال میں خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے کہ کہیں کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہونے پائے کہ جس کے نتیجے میں اس کے افراد ضائع ہو جائیں اور اس کی تمام تر محنت رائیگاں وبیکار جائے۔

علمائے امت نے اس بات کو کھول کر بیان کر دیا ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام فرض کفایہ ہے اگر کسی علاقے یا ملک میں کوئی جماعت گروہ یا تنظیم اس عظیم فریضہ کو انجام دینا شروع کر دے تو وہاں کے دیگر باشندگان سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن اگر اس علاقہ کے تمام باشندگان تبلیغی امور میں دلچسپی لیں تو یہ ان کے لئے درجات کی بلندی کا باعث بنے گا اور وہ سنت مؤکدہ پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور اگر اس علاقے کا کوئی بھی فرد یہ تبلیغی فریضہ سرانجام دینے کے لئے کمر بستہ نہ ہو تو وہاں کے تمام باشندے برابر کے گناہگار ہوں گے۔ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ہمت وبساطت کے مطابق تبلیغی مشن میں حصہ لے، اور داعی کے لئے مخصوص انعامات الٰہی سے اپنی خالی جھولی کو بھر لے۔

داعی اور دعوت کے فضائل:

داعی اور مبلغ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کیا قدر و قیمت اور کیا شان ورفعت ہے، اس کا اندازہ کرنے کیلئے پہلے میں قرآن کی ایک آیت پیش کرتا ہوں جس میں اللہ کریم دنیا کے بدبخت ترین

شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔

[البقرۃ: ۲/۱۱۴]

" اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون شخص ہوگا کہ جو اللہ کے گھروں (مساجد) میں جانے سے روکے (کہ وہاں جا کر) اللہ کے گھر میں اللہ کا نام لیا جائے اور ان مساجد کو اجاڑنا چاہے۔"

اسی طرح دوسرے مقام پر اللہ کریم نے، داعی کی عظمت بیان کرتے ہوئے ایسے ہی اسلوب میں فرمایا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔

[حم السجدہ: ۴۱/۳۳]

" اور اس شخص سے (بات کے اعتبار سے) اچھا کون ہو سکتا ہے؟ جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں۔"

دیکھیں اس آیت مبارکہ میں مبلغین اور داعیان حق کو کس عمدہ اور اعلیٰ انداز سے سراہا گیا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو مساجد کہ جہاں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، عبادت ہوتی ہے، دعوت الی اللہ کا کام ہوتا ہے، وہاں جانے سے روکتا ہے، وہ کائنات کا مبغوض اور "اظلم" سب سے بڑا ظالم بن جاتا ہے اور دوسرا شخص اللہ کی طرف بلاتا ہے وہ دنیا کا بہترین شخص قرار پاتا ہے۔ یہ فیصلہ اللہ کریم کے دربار کا ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

داعیانِ حق شناس کی جماعت میں سے سب سے اعلیٰ وارفع شان داعی حق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور آپ کے بعد درجہ بدرجہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین، محدثین، آئمہ کرام، صلحائے امت اور علمائے ربانی رحمہم اللہ علیہم کی ہے کہ جنہوں نے اپنے علم اور صلاحیت کے مطابق دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دیا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا...الخ یہ آیت مبارکہ دعوت و تبلیغ کے کام کی اہمیت اجاگر

کرنے کیلئے سب سے زیادہ جامع ترین آیت ہے۔ اس میں اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مبلغین دین متین بارگاہِ الٰہی میں بہت بڑے شرف وعظمت اور مقام ومرتبہ کے حامل ہیں۔ یہ آیت مبارکہ ہر اس شخص کے متعلق ہے کہ جس نے دعوت دین کا مبارک کام کیا۔ نیک عمل کیے اور اپنے مسلمان ہونے کا ببانگِ دھل اعلان کیا۔ خواہ وہ گذشتہ دور میں تھا، یا اب حال میں موجود ہے یا پھر آئندہ زمانہ مستقبل میں پایا جائے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے جیسا کہ امام عبدالرزاق نے معمر کے حوالے سے امام حسن بصری رحمہ اللہ کے متعلق روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے "حم السجدہ" کی آیت "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِمَّنْ دَعَا اِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" تلاوت کی اور پھر فرمایا کہ یہ (داعی) اللہ تعالیٰ کا حبیب ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا منتخب کردہ شخص ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو اہل زمین میں سے سب سے زیادہ محبوب ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کیا اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا اور خود اس دعوت کے مطابق نیک عمل کیا اور اپنے مسلم ہونے کا اعلان کیا یہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے"۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۶/۴، قرطبی: ۳۰/۱۵، الکشاف: ۴۵۳/۳]

امام ابن قیم رحمہ اللہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے علم کی اشاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی طرف دعوت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ان اعمال میں سے ہے جو سب سے افضل واعلیٰ ہیں اور جن کا بندے کے لئے دنیا وآخرت میں نفع سب سے زیادہ ہے"۔ [جلاء الافہام: ۱۱۵، ۴۱۴]

دعوت الی اللہ کے متعلق امام رحمہ اللہ صاحب نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

"یہ بندے کا سب سے زیادہ عزت وقدر والا اور افضل مقام ہے۔"

[مفتاح دار السعادۃ: ۱۴۵/۱]

سورۃ "حم السجدہ" کی اسی آیت کے کی تفسیر کے تحت شیخ عبدالرحمٰن سعادی تحریر کرتے ہیں:

" یہ درجہ کامل تو صدیقوں کا ہے جنہوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے نفوس کی تکمیل کیلئے محنت کی اور رسولوں کی کامل وراثت بھی ان کے حصے میں آئی"۔

[تفسیر السعادی: ۸۲۰]

یہ داعی کی عظمتیں ہیں جو اللہ کریم نے اسے عطا کی ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

ہدایت کا سبب بننے والے داعی کا عظیم درجہ:

دعوت الی اللہ کی عظمت ورفعت واضح کرنے والے امور میں ایک یہ بھی ہے کہ جس شخص (داعی) کے ذریعہ کوئی دوسرا انسان ہدایت کی دولت پالے تو اس شخص (داعی) کا اجر وثواب انتہائی رفیع الشان ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ خیبر کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا کرتے وقت ارشاد فرمایا:

اُنْفُذْ عَلٰى رِسْلِكَ حَتّٰى تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ وَاَخْبِرْهُمْ بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْهِ فَوَاللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ

[بخاری: کتاب المغازی، مسلم: کتاب فضائل الصحابہؓ]

"اے علی (رضی اللہ عنہ)! سیدھے جانا۔ یہاں تک کہ تو ان (یہودیوں) کے علاقے میں پہنچ جائے پھر انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اور ان کے ذمہ اللہ تعالیٰ کے حق سے انہیں آگاہ کرنا۔ اللہ کی قسم! اگر تیری وجہ سے (یعنی تیری داعیانہ کوشش کی بنا پر) اللہ تعالیٰ (صرف) ایک بندے کو ہدایت دے دے تو وہ تیرے لئے سرخ رنگ کے اونٹوں کے حصول سے زیادہ بہتر ہے"۔

سرخ اونٹ اس وقت کی نہایت قیمتی چیز تھی۔ ایسے سمجھ لیں جیسے آج ہمارے ہاں سب سے قیمتی مہنگی اور جدید ترین گاڑی ہو۔ مثلاً: لیموزین کار۔ یعنی اگر تمہاری دعوت کے نتیجے میں ایک شخص بھی شاہراہِ توحید کا راہی بن گیا تو تیرے لئے یہ کئی سرخ اونٹوں (لیموزین

گاڑیوں) سے زیادہ بہتر ہے۔اس لیے کہ اس عمل کا بدلہ جنت ہے کہ جس کا مقابلہ دنیا کی قیمتی سے قیمتی ترین چیز بھی نہیں کر سکتی۔

داعیان حق کے دعوتی پروگرام چونکہ اکثر مساجد میں ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کرکے دعوت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، تو اس عمل پر بھی ثواب عظیم کی بشارت پر مبنی حدیث ملاحظہ ہو:

"سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص مسجد کی طرف روانہ ہو خیر سیکھنے یا سکھلانے کے سوا اس کا کوئی مقصد نہ ہو تو اس کے لئے ایسے حج کرنے والے کے مثل ثواب ہے جس کا حج پورا ہو چکا ہو"۔

[الترغیب والترہیب:۱/۱۱۰]

اندازہ لگائیں اللہ کریم کی بے پایاں شان کا کہ لوگوں کو خیر سکھلانے والے داعی کا رتبہ کس قدر بلند و بالا اور عظیم الشان ہے۔اللہ ہمیں بھی ان میں شامل فرمائے۔آمین

داعی کے لئے عمل کرنے والے کے برابر ثواب:

یہ بھی داعی کی شان و رفعت کی دلیل ہے کہ اس کو اس کی دعوت کے نتیجے میں عمل کرنے والے کے اجر کے برابر ثواب ملے گا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا تو جس قدر ثواب اس کی دعوت پر عمل کرنے والوں کو ملتا ہے اتنا ہی اس داعی کیلئے ہے، اس کو ملنے والے اجر کی وجہ سے ان (عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی اور جس نے گمراہی کی طرف بلایا اس کے ذمہ اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس کی دعوت کے نتیجے میں گناہ کرنے والوں پر ہو گا۔ اور اس کو ملنے والے گناہ کے سبب ان (دوسرے لوگوں) کے گناہوں میں کچھ کمی نہ ہو گی۔"

[صحیح مسلم: کتاب العلم]

یاد رہے کہ دعوت دینے والے کے لئے یہ ثواب کسی خاص عمل کی دعوت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ نیک کام جس کی طرف داعی لوگوں کو بلائے اور لوگ اس کی دعوت

قبول کریں اور وہ نیک عمل کریں تو اس داعی کو اس عمل کی بنا پر اجر وثواب ضرور ملتا رہتا ہے۔ یہ کام ضروری نہیں بہت بڑا اور رفیع الشان ہی ہو تو تب اجر ملے گا۔۔۔ نہیں بلکہ اگر یہ کام معمولی وادنیٰ حیثیت کا حامل بھی ہو گا تو بھی اجر داعی کو ضرور ملے گا۔ اس کا ثبوت ایک اور حدیث سے بھی ملتا ہے جس میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ۔ [مسلم: کتاب الامارۃ]

" جس نے خیر کی طرف رہنمائی کی اس کے لئے عمل کرنے والے کے مثل اجر وثواب ہے"۔

داعی قابل رشک ہے:

داعی کی ہی یہ خوش قسمتی اور بلند نصیبی ہے کہ زبان نبوت سے اس کی ذات پر رشک کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے کہ یہ شخص اس قابل ہے کہ اس کی قسمت پر رشک کیا جاسکے۔ یہ داعی کیلئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشک کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

" قابل رشک تو صرف دو ہی آدمی ہیں، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ مال عطا فرمائے اور وہ اسے حق کی راہ میں لٹائے۔ اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ حکمت سے نوازے اور وہ اس کے ذریعہ لوگوں میں فیصلہ کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم (دعوت) دے۔" [بخاری: کتاب العلم]

داعی کے لئے سب سے بڑا اعزاز:

بندہ دنیا میں آتا ہے زندگی گزارتا ہے اور مر جاتا ہے، مرنے کے بعد اس بات کی گارنٹی نہیں کہ اس کی اولاد اور پسماندگان نیک و متقی ہی بنیں گے اور اچھے ونیک عمل ہی کریں گے اور خاص طور پر اس کی اولاد اس کی مغفرت کے لئے نیک عمل ہی کرتی رہے گی اور اس کی مغفرت وبخشش کے لئے ضرور دعا کرے گی کہ جس پر اسے سب سے زیادہ امید ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد یہ نیک اعمال کے ذریعے میرے کام آئے گی۔ لیکن داعی کو یہ بہت بڑا اعزاز اور شرف حاصل ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا سیونگ اکاؤنٹ کھلا رہتا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں مسلسل ثواب کا ذخیرہ پہنچتا رہتا ہے۔ یعنی داعی کا اجر وثواب اس کی موت کے

ساتھ منقطع نہیں ہوتا بلکہ جب تک اس کی دعوت پر عمل ہوتا رہے گا لوگوں کے مجموعی ثواب کے برابر اس داعی کا ثواب جاری وساری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ۔ [الانفطار: ۵/۸۲]

" اس دن انسان اپنے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے اعمال کو جان جائے گا۔ "

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر یوں بیان کی:

مَا قَدَّمَتْ مِنْ خَيْرٍ وَمَا اَخَّرَتْ مِنْ سُنَّةٍ اِسْتَنَّ بِهَا بَعْدَهٗ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنِ اتَّبَعَهٗ اَوْ سَيِّئَةٍ فَعَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا ۔ [شرح السنہ: کتاب العلم]

" جو نیک عمل اس نے خود کیا اور جو اچھا طریقہ اس نے اپنے پیچھے چھوڑا اور اس کے مطابق عمل کیا گیا۔ تو عمل کرنے والے کے مثل اس کے لئے ثواب ہے اور اس کے چھوڑے ہوئے برے طریقے کے مطابق جس نے غلط کام کیا اسی کے بقدر اسکے ذمہ گناہ ہے"۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے محمد بن کعب قرظی نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر بیان کی ہے:

مَا قَدَّمَتْ فِيْ حَيَاتِهَا وَمَا اَخَّرَتْ مِمَّا سُنَّتَهٗ فَعَمِلَ بِهٖ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ [المحرر الوجیز: ۲۴۶]

" اس نے اپنی زندگی میں جو اعمال کئے اور جو طریقے اپنے بعد چھوڑے اور ان کے مطابق اس کے مرنے کے بعد عمل کیا گیا"۔

اس بات پر شاہد اور بھی بہت سی احادیث اور اصحاب رسول کے اقوال موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ داعی کی یہ شان اور فضیلت ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کو اس کے کیے ہوئے وعظ ونصیحت اور دعوت کے نتیجے میں متاثر ہو کر عمل کرنے والوں کے اعمال کا مجموعی ثواب کے برابر اجر وثواب پہنچتا رہتا ہے... اس کے درجات جنت میں بلند ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ اللہ کریم کی جنتوں میں اللہ تعالیٰ کی عنایتوں سے مسلسل نوازا جاتا ہے۔

یہ رفعتیں... یہ شانیں... یہ فضیلتیں... یہ بلندیاں... یہ عظمتیں اور یہ سعادتیں حاصل کرنے کے لئے آج سے ہی ہمیں اپنی زندگی قرآن حکیم کی اس ہدایت کے مطابق گزارنی ہوگی۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ [الانعام:۱۶۲/۶]

"بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا (زندہ رہنا) اور میرا مرنا۔۔۔سب کچھ صرف اور صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہی ہے"۔

جہاں دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے اس قدر بشارات، خوش خبریاں اور درجات کی بلندی اور ثواب کے پہاڑ ہیں تو وہاں ہی بے عمل داعیوں کہ جو زبانی طور پر دعوت تو کچھ دیتے ہیں لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ ان کا عمل ان کی دعوت کے برعکس ہوتا ہے، ان کے لئے وعید بھی اسی قدر اذیت ناک ہے۔ اس بات کی رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے ترہیبی انداز میں یوں وضاحت کی، فرمایا:

"قیامت کے دن کسی شخص کو لایا جائے گا اور اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان کے گرد اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے۔ (اس پر) دوزخی جمع ہو کر اسے کہیں گے: "اے شخص! کیا بات ہے، کیا تو نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا؟ اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟"۔۔۔وہ جواب دے گا: "ہاں! (میں نیکی کا حکم بھی دیا کرتا تھا اور برائی سے منع بھی کیا کرتا تھا) میں لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتا تھا لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا (اور) انہیں برائی سے روکتا تھا لیکن خود برائی کرتا تھا"۔

[بخاری: کتاب بدء الخلق]

ایک دوسری روایت میں بھی رسول اللہ نے اسی بات کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا:

"میں نے معراج کی رات کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: "یہ لوگ کون ہیں؟" جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا: "یہ آپ کی امت سے مقررین ہیں۔ یہ لوگوں کو نیکی اور تقویٰ کی تلقین کرتے تھے مگر خود (اس پر عمل کرنے سے) بھولے ہوئے تھے"۔

[بیہقی فی شعب الایمان، شرح السنۃ للبغوی: ۳۵۳/۱۴]

جو شخص دعوت کے مواقع اور وسائل پانے کے باوجود اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور کنی کتراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جس علم سے نوازا ہے اسے چھپاتا ہے۔ اور اپنے علم کو محض

دنیا کے مناصب اور عہدے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس علم کو دنیا کی چند روزہ اور فنا ہونے والی چیزوں سے متمتع ہونے کا ذریعہ بناتا ہے۔

اس کے متعلق رسول رحمت کی وعید کچھ یوں وارد ہوئی ہے:

" جس شخص نے ایسا کوئی علم حاصل کیا جس سے اللہ کریم کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے مگر اس نے اسے دنیا کی کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے سیکھا (استعمال کیا) تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا"۔ [سنن ابی داؤد و ترمذی: کتاب العلم]

حالانکہ جنت کی خوشبو جنتیوں کو چالیس میل کی مسافت اور دوری سے آئے گی، لیکن یہ شخص اس کے باوجود جنت تو کیا اس کی اس قدر دور سے آنے والی خوشبو کو بھی نہ پا سکے گا۔

علم حاصل کر لیا ہے تو اب اس کو دوسروں تک پہنچانا ضروری ہے۔ اور جو شخص اپنے حاصل کئے ہوئے علم کو پوچھنے پر بھی چھپاتا ہے تو اس کے متعلق بھی وعید سن لیں، داعی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" جس سے کسی علم کے بارے میں پوچھا جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔" [ابو داؤد و ترمذی: کتاب العلم]

اے میرے بھائیو! آج سے ہم بھی دعوت کا کام شروع کر دیں تاکہ ان بشارتوں وسعادتوں کے مصداق بن کر اللہ کے کامیاب بندوں میں شامل ہو جائیں۔ اللہ کریم سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے داعی اور مجاہد بندوں میں شامل کر لے اور دعوت دین کا کچھ کام ہم سے بھی لے لے کہ یہ ہماری خوش نصیبی و خوش بختی ہو گی۔ کہ جس کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر دعوت الی اللہ کا پرچم سربلند کر دیں اور اسی فریضہ کی بجاآوری میں یہ کہتے ہوئے کہ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان دے دیں اور یوں توحید کی دولت لئے ہوئے اللہ احکم الحاکمین کے دربار میں سرخرو ہو کر پہنچیں اور پھر مؤمنین سے جنت میں ملاقات کریں۔ ان شاء اللہ

باب:۲

داعی اور دعوت

داعی کی تعریف:

داعی وہ ہے جو شرعی طور پر دعوت الی اللہ کے کام پر مامور ہے۔ چنانچہ اس کی تعریف اور اس کے مکلّف ہونے کے دلائل بیان کرنا ضروری ہے۔ داعی جب اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرتا ہے تو اسے کچھ تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے کام میں اس کے لیے معاون ثابت ہو اور اس کے لیے یہ عظیم کام آسان ہو سکے۔ اسی طرح اسے اسلامی اخلاقیات کی ایک متعین قسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس کا سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

داعی اوّل:

اسلام کے داعی اول، رسول کریم ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاۤ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

[الاحزاب ۳۳/۴۵، ۴۶]

اے نبی ﷺ! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کو بار بار خطاب کر کے آپؐ کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر قائم ودائم رہنے اور اس سے پہلو تہی نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح کی آیات میں سے اللہ تعالیٰ کے چند ارشادات یہ ہیں:

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ [الحج ۲۲: ۶۷]

"تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔"

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [القصص ۲۸: ۸۷]

"اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔"

قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ [الرعد ۱۳: ۳۶]

"تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔"

آپ ﷺ ہمیشہ رب کی طرف دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آیا اور آپ ﷺ اس حالت میں اپنے رب کے پاس پہنچ گئے کہ آپ ﷺ اپنے رب سے راضی تھے اور آپ ﷺ اپنے رب سے راضی تھے اور آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ سے راضی تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی طرف سے ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

رسولوں کا کام: دعوت الی اللہ:

حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ تمام رسولوں کا کام تھا۔ اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کے پاس بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ سب بلا استثنا اپنی اپنی قوموں کو، اور جن کی طرف انہیں بھیجا گیا تھا، اس بات کو دعوت دیتے رہے کہ اللہ پر ایمان لائیں، اسے اکیلا معبود سمجھیں اور اس کی اُسی طرح عبادت کریں جس طرح اللہ تعالیٰ انہیں اس کا حکم دے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔

[الاعراف ۷: ۵۹]

"ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ [الاعراف ۷: ۶۵]

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کی بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ [الاعراف ۷۳: ۷]

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کی بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔ [الاعراف ۷ :۸۵]

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

یہی معاملہ تمام رسولوں کا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ کی طرف، اسی کی عبادت کی طرف اور دوسروں کی عبادت سے اعلان بیزاری کرنے کی طرف بلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ [النحل ۱۶: ۳۶]

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔"

چنانچہ اللہ کے رسول ہی داعی الی اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دعوت کے لیے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے چن لیا ہے۔

دعوت الی اللہ میں امت کی شرکت:

پیچھے ہم نے بتایا ہے کہ رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے پہلے داعی تھے۔ ہم نے وہ آیات بھی ذکر کی ہیں جن میں آپ ﷺ کی دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات کے حکم میں سارے مسلمان بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ اصولی طور پر اللہ تعالیٰ جب اپنے نبی کو خطاب کرتا ہے تو اس میں امت بھی داخل ہوتی ہے، الّا یہ کہ کوئی چیز اس سے مستثنیٰ ہو جائے، مگر دعوت الی اللہ کا حکم اس مستثنیٰ میں شامل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ عزو شرف بخشا ہے کہ اسے اپنے رسول کے ساتھ دعوت کے کام میں شریک کیا ہے۔ مگر یہ عزو شرف صرف ان آیات سے مستفاد نہیں ہے جن میں اللہ

تعالیٰ نے اپنے نبی کو دعوت کا حکم دیا ہے، بلکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں یہ حکم صراحت کے ساتھ اور مستقل طور پر بھی آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ [آلِ عمران ۳: ۱۱۰]

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔"

اس آیت کریمہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ یہ امت بہترین ہے۔ دوسری یہ کہ اس امت کو یہ اعزاز اس وجہ سے ملا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی ہے، اور یہ فریضہ رسول اللہ اور باقی تمام رسولوں کا بھی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پہلی چیز یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اور ہر قسم کے شرک سے بیزاری کی طرف دعوت دی جائے۔ بلکہ قرآن کریم نے دعوت کو مومنوں کی صفات میں سے ایک صفت بتایا ہے، برعکس منافقین کے، جو لوگوں کی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور دوسرے راستوں کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ۔

[التوبۃ ۷: ۶۷]

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

[التوبۃ ۷: ۷۱]

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے امر المعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مومنوں کے مخصوص اوصاف میں سے ہے اور اس میں سر فہرست دعوت الی اللہ ہے۔

ہم اس پر یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی تعریف اسی چیز سے کی ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کی تعریف کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے بارے میں فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ

[الاعراف ۷: ۱۵۷]

"وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔"

دعوت الی اللہ کا مکلّف کون؟

سابقہ بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ دعوت الی اللہ کا مکلّف ہر مسلمان مرد اور عورت ہے۔ اس لیے کہ امت مسلمہ انہی سے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ جو بحیثیت مجموعی دعوت الی اللہ کی مکلّف ہے، اس کا ہر عاقل بالغ اس دعوت کا مکلّف قرار پاتا ہے، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت۔

معلوم ہوا کہ اس فریضے کے مکلّف صرف علماء یا بقول بعض مولوی اور مذہبی لوگ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب کا فریضہ ہے۔ ہاں البتہ اس دعوت کی تفصیلات اور اس کے احکام و معانی کے لیے یہی لوگ مخصوص رہیں گے، اس لیے کہ ان چیزوں کے بارے میں ان کا علم زیادہ وسیع ہوتا ہے اور دعوت کی جزئیات کو وہی جانتے ہیں۔

اس بات کی کہ دعوت الی اللہ کا مکلّف ہر مسلمان مرد و عورت ہے، مزید وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [یوسف ۱۲: ۱۰۸]

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہی تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا تھا۔ وہ بھی بصیرت اور علم ویقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، جیسا کہ ان کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم ویقین کے ساتھ اللہ کے طرف دعوت دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے ایمان کے ضروری لوازم میں سے ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ اگر کوئی شخص دعوت سے پیچھے رہے گا تو یہ اس کے ایمان میں نقص یا خلل کی دلیل ہوگا۔ اس کی تلافی اسی طرح کی جاسکتی ہے کہ آدمی دعوت الی اللہ کے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمارہا ہے کہ لوگوں کو بتائیں کہ یہ میرا راستہ، یعنی میرا طریقہ، میرا مسلک اور میری سنت ہے۔ یعنی اس کلمے کی طرف دعوت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بصیرت اور ایمان ویقین کے ساتھ یہ دعوت دیتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی بھی اسی چیز کی طرف دعوت دیتے تھے جس کی طرف ان کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بصیرت، یقین اور عقلی وشرعی دلیل کے ساتھ دعوت دی۔

بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔ "جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک دعوت پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

یہاں "شاہد" کے حکم میں ہر وہ مسلمان داخل ہے جو اسلام کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

دعوت الی اللہ کا فریضہ کبھی انفرادی طور پر ادا ہو جاتا ہے اور کبھی اجتماعی طور پر۔ اگر ہم اس کی تعبیر کے لیے تھوڑی باریکی میں جائیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ فریضہ دو طرح سے ادا ہو سکتا ہے:

پہلا یہ ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ایک فردِ مسلم کے اس فریضے کے لیے اٹھ کھڑا ہو، اور دوسرا یہ کہ اس فریضے یا اس کے کسی پہلو کو ایک ایسی جماعت کے فرد کی حیثیت سے ادا کرے جو دعوت الی اللہ کے لیے قائم ہوئی ہو۔

اس سب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ [آل عمران ۳: ۱۰۴]

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضروری ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ اس امت میں ایک فرقہ ایسا ہونا چاہیے جو اس کام کے لیے مخصوص ہو، اگرچہ یہ امت کے ہر فرد پر اپنی جگہ ایک فریضہ ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ رَّاٰى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ۔

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتی تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت دعوت کا کام زیادہ ہو تو داعیان دین کا اجتماعی طور پر دعوت کے کام کے لیے اٹھ جانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر بت پرستانہ معاشروں میں دین کی دعوت دینی ہو، جو شیطان کی آماجگاہ ہوتے ہیں اور جہاں اس نے انڈے چوزے دیے ہوتے

ہیں، جہاں اس نے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہوتا ہے اور انہیں شرک کی بھٹی میں سرنگوں کیا ہوتا ہے، جیسے افریقہ کے مشرکانہ معاشرے وغیرہ۔

اس طرح کے علاقے دعوت کی نشرواشاعت اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کے لیے زیادہ اور منظّم جدوجہد کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک ایک فرد کی کوشش یا مختلف افراد کی انفرادی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔ اس اجتماعی مشنری کوششوں کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو نبی ﷺ کا طریقہ تھا کہ جو شخص اسلام قبول کرتا تو نبی ﷺ اسے حکم دیتے کہ وہ دارالہجرت میں چلا آئے، تاکہ اس کی جدوجہد دوسرے مسلمانوں کی جدوجہد کے ساتھ مل جائے اور رسول اللہ ﷺ اس جدوجہد کو صحیح رخ پر ڈال دیں۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ [المائدہ ۵: ۲]

"جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو"

ہمیں اس بات کی ایک اور دلیل ملتی ہے کہ دعوت کے کام کے لیے جمع ہونا اور اجتماعی طور پر دعوت دینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ بلکہ ایسے حالات میں تو یہ واجب ہوگا، جب کہ بھلائی کا حصول اس کے بغیر ممکن نہ ہو۔ علامہ جصاصؒ کی روایت کی رو سے امام ابو حنیفہؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے تنظیم سازی اور اپنی کوششوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

شبہات و اعتراضات:

بعض لوگوں کو یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام ان پر لازم نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مذہبی لوگ نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایک فرض کفایہ ہے جو صرف علما کا کام ہے، اور یہ عام لوگوں پر لازم نہیں ہے۔

اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ [آل عمران ۳: ۱۰۴]

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر، جیسا کہ ہم نے علامہ ابن کثیرؒ سے نقل کی ہے، یہ ہے کہ اس امت میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو اسی کام کے لیے فارغ ہو، اگرچہ یہ امت کے ہر فرد کا فریضہ ہے۔ اور امام رازیؒ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ کے ارشاد مِنْكُمْ کے بارے میں دو قول ہیں:

۱: ایک قول یہ ہے کہ حرف مِنْ یہاں تبعیض کے لیے نہیں ہے اور اس کی دو دلیلیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ [آل عمران ۳: ۱۱۰] میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری امت پر فرض کیا ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی بھی شخص جو مکلّف ہو تو اس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، ہاتھ سے، یا زبان سے یا پھر دل سے، ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے نفس سے ضرور کو دور کرے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہوئے: "تم ایک ایسی امت بن جاؤ جو بھلائی کی دعوت دینے والی، معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی ہو۔ رہا حرف من کا معاملہ تو وہ یہاں تبعیض کے لیے نہیں بلکہ تبیین کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ [الحج ۲۲: ۳۰]

"تو تم لوگ گندگی سے کنارہ کش رہو یعنی بتوں سے۔"

۲: امام رازی نے دوسرا قول یہ ذکر کیا ہے "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے کہ امت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر نہیں ہوتے۔ پھر اس دوسرے قول کے قائلین کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ تکلیف علما کے ساتھ مختص ہے، اس لیے کہ دعوت الی الخیر اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ

آدمی کے پاس "خیر"، "معروف" اور منکر کا علم ہو۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ تکلیف علما کے طرف متوجہ ہے نہ کہ عوام کی طرف، اور امت میں علما بعض ہی ہوتے ہیں۔

اس آیت کا یہی مفہوم اور اس کے بارے میں یہی دو قول تفسیر قرطبیؒ اور تفسیر جصاص میں بھی مذکور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قول امام رازیؒ نے ذکر کیا ہے وہ صحیح تر قول ہے، اس لیے کہ اس کے شاگردوں نے بھی اسی سے استدلال کیا ہے۔ یہ وہی قول ہے جسے ابن کثیر نے اپنے دقیق الفاظ میں بیان کیا ہے، جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ انہوں نے وجوب کو ہر فرد کی طرف سے قرار دیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس کا کام ہی دعوت الی الخیر ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لفظ "علما" کی وجہ سے اس مسئلے میں کسی حد تک التباس بھی پایا جاتا ہے، جو قول ثانی کے قائلین نے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ کی تشریح کرتے ہوئے اس اعتبار سے ذکر کیا ہے کہ دعوت الی الخیر علم کے ساتھ مشروط ہے۔ اس التباس کا دوسرا سبب فرض کفایہ کے الفاظ ہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں: اس میں شک نہیں کہ دعوت الی الخیر، جس کا اعلیٰ درجہ دعوت الی اللہ ہے، کے لیے علم ہونا شرط ہے، مگر علم کوئی ناقابل تقسیم اور ناقابل تجزیہ چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے قابل تقسیم بھی ہے اور قابل تجزیہ بھی۔ چنانچہ اگر ایک آدمی کو ایک مسئلہ معلوم ہے اور دوسرا معلوم نہیں ہے تو وہ پہلے مسئلے کا عالم اور دوسرے سے جاہل قرار پائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے مسئلے کے بارے میں وہ عالم ہی تصور کیا جائے گا، اور نتیجتاً اس میں ایک مسئلے کے حوالے سے دعوت کی شرط موجود ہے، اگرچہ دوسرے مسئلے کے بارے میں وہ مطلوبہ شرط پر پورا نہیں اترتا۔

اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز یا اس کے حکم سے بے خبر ہو وہ اس کی طرف دعوت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ جس چیز کی طرف داعی دعوت دے رہا ہے اس کے بارے میں علم، دعوت کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اس بنا پر ہر

مسلمان اسی قدر دعوت کا مکلّف ہے جتنا اس کے پاس علم ہے۔ اور علم کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

چنانچہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دعوت کا کام علما پر واجب ہے نہ کہ دوسرے لوگوں پر، تو اس سے مراد یہی ہوگی۔ یعنی یہ کام ان لوگوں پر واجب ہے جو کسی مسئلے اور اس کے حکم کو جانتے ہوں، خواہ وہ عام لوگوں میں سے ہوں یا ان لوگوں میں سے جن کو علم کا وافر حصہ ملا ہو۔ اس سے ان لوگوں کا قول فاسد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ علما سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو علم کا وافر حصہ ملا ہو، نہ کہ کوئی اور۔ ان "علما" کے لیے بعض اوقات "مذہبی لوگ" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ الفاظ بھی ہر مسلمان پر صادق آتے ہیں، اس لیے کہ وہ بھی مذہب اسلام کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ کام ان کے کسی گروہ تک محدود نہیں ہے۔

التباس کا دوسرا سبب فرض کفایہ کا مفہوم ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ جب بعض لوگ اس کو ادا کریں تو دیگر لوگوں سے تکلیف ساقط ہو جاتی ہے، اگرچہ یہ کام واجب سب کے اوپر ہوتا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

پھر ہو (یعنی دعوت کے عمومی وجوب کے قائل لوگ) کہتے ہیں کہ لفظ مِنْ تبیین کے لیے ہے نہ کہ تبعیض کے لیے۔ اور یہ کام اگرچہ واجب تو سب پر ہے مگر جب کچھ لوگ اس کو ادا کریں تو باقی لوگوں سے اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیر اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا [التوبۃ۹: ۴۱] اور اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا [التوبۃ۹: ۳۹] ہے۔ چنانچہ حکم عام ہے۔ پھر جب ایک گروہ اس کام کو انجام دے تو کفایت رفع ہو جاتی ہے اور باقی لوگوں سے تکلیف زائل ہو جاتی ہے۔

علامہ جصاصؒ آیت وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ [آل عمران ۳: ۱۰۴] کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ آیت دو معانی پر محیط ہے: ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب، اور دوسرے یہ کہ یہ فرض کفایہ ہے، نہ کہ فی نفسہٖ ہر ہر فرد پر، جب کہ دوسرے لوگوں نے اس فریضے کو ادا کیا ہو۔

علامہ جصاصؒ کا یہ کہنا کہ "یہ فی نفسہٖ ہر ہر فرد پر واجب نہیں ہے، جب کہ دوسرے لوگوں نے اس فریضے کو ادا کیا ہو"، فرض کفایہ کا مقصود بیان کر رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگ اس فریضے کو ادا کر رہے ہوں تو دوسرے لوگوں سے اس کا واجب ساقط ہو جاتا ہے۔ جب کہ فرض عین کا معاملہ اس کے برعکس ہے، کیوں کہ وہ اس کے بغیر ساقط نہیں ہوتا کہ ہر ہر فرد اس کی خاطر اٹھ کھڑا ہو۔

معلوم ہوا کہ دعوت الی الخیر، جس کا اعلیٰ درجہ دعوت الی اللہ ہے، بقدرِ استطاعت ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ کیوں کہ یہ دعوت جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، مومنوں کی صفات میں سے ہے۔ اور اس لیے بھی کہ حدیث شریف نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو حکم دیا ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک منکر کا ازالہ کرے۔ جب ایک یا چند افراد سے مقصود حاصل ہو جائے تو باقی لوگوں کو حکم نہیں دیا جائے گا کہ وہ دوبارہ منکر کا ازالہ کریں۔ ان کا اس بات پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا کہ انہوں نے منکر کا ازالہ کیوں نہ کیا۔

ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ کسی اور کا انتظار کیے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ آگے نہیں بڑھے گا تو بعض اوقات دوسرا بھی اس کے لیے نہیں آئے گا، لہٰذا دونوں گناہ گار ہوں گے۔ مسلمان اس وجہ سے اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ذکر کیا ہے کہ:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [یوسف ۱۲: ۱۰۸]

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

چنانچہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک متعین شخص اللہ کی طرف دعوت نہیں دیتا، یا کسی وقت وہ اس فریضے سے

غافل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مسلمان اس کے لیے اٹھ جاتا ہے تو دعوت دینے والے کو ثواب ملے گا اور دوسرا اس سے محروم ہوگا۔ لیکن اگر ایک مسلمان دعوت الی اللہ کو جان بوجھ کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مفہوم میں شامل نہیں ہوگا کہ: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ۔۔۔ [یوسف ۱۲: ۱۰۸] اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیروکار تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ فرض کفایہ کے معانی میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا حکم تمام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کہ وہ اس فریضے کو ادا کریں۔ جو شخص عملاً اس کام پر قادر ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ براہ راست اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

اس طرح آیت: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

[آل عمران ۳: ۱۰۴]

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں" کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمان اس طرح کا ایک گروہ تیار کریں۔ یعنی ایک ایسی جماعت جس کا کام ہی دعوت الی اللہ ہو۔ اور اس کے بعد اس جماعت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں، تاکہ یہ جماعت جس مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے وہ مقصد حاصل ہو جائے۔ وہ مقصد یہ ہے اللہ کا دین زمین پر قائم ہو اور اس کی دعوت دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے۔ اگر مسلمانوں نے یہ کام نہ کیا تو سارے گناہ گار ہوں گے، خواہ کوئی دعوت کا اہل ہو یا نہ ہو۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ دعوت الی اللہ کا کام بعض لوگوں پر واجب ہے اور بعض پر واجب نہیں ہے، کیوں کہ یہ فرض کفایہ ہے تو پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرض کفایہ سے بری الذمہ ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جو لوگ اس ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، ان سے اس کام میں کفایت ہو سکے۔ لیکن جب ان سے کفایت نہ ہو رہی ہو تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس فرض کو ادا کرے۔ خصوصاً ہمارے دور میں یہ بات بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ شرک و بت پرستی اور جاہلیت نے افریقہ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں انسانی

معاشروں کو اپنے لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ان ممالک میں دعوت الی اللہ کی نشرواشاعت کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کی ضرورت ہے، جس میں تمام مسلمان اپنی وسعت کے مطابق شریک ہوں، خواہ مال ودولت کے ساتھ ہو یا علم وفکر اور اختیارات کے ساتھ۔

بعض لوگ خوش فہمی میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غلط استدلال کرتے ہیں کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔ [المائدة۵: ۱۰۵]

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں نہیں بگڑتا، اگر تم خود راہ راست پر ہو۔"

اس طرح وہ دعوت کے فریضے سے جان چھڑانے اور اس کے بارے میں اپنی سُستی وکوتاہی کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اس سے یہ غلط فہمی لاحق ہوجاتی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی جگہ پر نیکوکار اور صالح ہو تو یہ آیت کریمہ اسے دعوت الی اللہ کی ذمہ داری سے بری الذمہ کردیتی ہے۔

یہ غلط فہمی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی بعض لوگوں کو لاحق ہو گئی تھی، اس لیے انہوں نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! تم اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہو کہ عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ، مگر تم اس کو غلط مقام پر رکھتے ہو۔

میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرمارہے تھے:

اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْا عَلٰی یَدَیْهِ یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ

لوگ جب ظالم کو (ظلم کرتے ہوئے) دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں گرفتار کردے۔

اس کے علاوہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اسی آیت میں ہر مسلمان پر دعوت الی اللہ کے لازم ہونے کی تاکید اور اس غلط فہمی کی نفی پائی جاتی ہے جس کو دعوت الی اللہ سے جی چرانے والوں نے پلے باندھ لیا ہے۔ وہ تاکید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

اِذَا اهْتَدَیْتُمْ "یعنی اگر تم خود راہ راست پر ہو"

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بقول:

ہدایت، فرض کی ادائیگی سے تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان جیسا کہ دیگر فرائض کو ادا کرتا ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے تو گمراہوں کی گمراہی ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

بعض لوگوں کو ایک اور شبہ لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں باطل عام ہو گیا ہے اور اب دعوت الی اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، چنانچہ مسلمان کو چاہیے کہ اپنی فکر کرے اور مخلوق کا معاملہ چھوڑ دے۔ اس شبہے کا، جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے، جواب یہ ہے کہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے، خواہ مقصود حاصل ہوتا ہے یا نہیں، اور خواہ لوگ اس کو مانتے ہیں یا نہیں۔ یہی شبہ سابقہ اقوام کو بھی لاحق ہوا تھا جن کے قصے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ ان واقعات میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ دعوت کے علم برداروں نے اس شبہے کا کیا جواب دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اَللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ [الاعراف ۷: ۱۶۴۔۱۶۵]

اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کی حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اُس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے، اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

یہ آیت کریمہ ایک بستی کے لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو تین گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ گناہوں میں مبتلا ہو گیا تھا، دوسرا گروہ ان کے اس فعل کو ناپسند کرتا تھا

اور انہیں وعظ ونصیحت بھی کرتا تھا، جب کہ تیسرا گروہ خاموش تھا، وہ نہ گناہ کرتا تھا اور نہ کسی کو برائیوں سے روکتا تھا۔ اس آخری گروہ نے روکنے والوں سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے؟

یعنی تم ان لوگوں کو کیوں روکتے ہو، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ تو تباہ وبرباد ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے مستحق ہیں۔ چنانچہ ان کو اس کام سے روکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس پر روکنے والوں نے ان کو وہی جواب دیا جو بالکل درست تھا، اور وہ یہ کہ مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ "یعنی تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے"۔

مطلب یہ ہے کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم سے مواخذہ کیا جائے گا تو ہم اپنے رب کے سامنے معذرت کریں گے کہ ہم تو یہی کر سکتے تھے۔ کہ ان گناہ گاروں کو ان کے گناہوں سے باز آنے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے۔

ان کا دوسرا جواب یہ تھا کہ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ "یعنی اس امید پر کہ شاید یہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔"

مطلب یہ کہ ہماری ناپسندیدگی اور اللہ کی طرف رغبت وانابت کی دعوت سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ہماری بات مان لیں اور راہِ راست پر آجائیں۔

اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب تک دعوت کی قبولیت کا احتمال موجود ہو تو عظ وارشاد اور دعوت الی اللہ کو جاری رکھنا چاہیئے تاکہ جسے رہنا ہے وہ دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل کے ساتھ ہلاکت سے دوچار ہو۔

بعض لوگ ایک اور شبہے میں پڑجاتے ہیں۔ وہ اس آیت سے غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا [البقرۃ۲: ۲۸۶] اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

یہ لوگ اس آیت سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ دعوت الی اللہ ایک محنت اور مشقت کا کام ہے، اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ دلیل بھی دراصل ضعیف الایمان اور کمزور دین داری والے لوگوں کی ہے۔ اس طرح کی مشقت تو ان کو اس وقت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے جب یہ دنیا کے معمولی بکھیڑوں میں مصروف ہوتے ہیں، جیسے دنیا کا کوئی معمولی فائدہ وغیرہ۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں دعوت دین کی خاطر کچھ مشقت کرنا کوئی مہنگا نہیں، خصوصاً جب کہ اس مشقت کا اجر بہت زیادہ ہے۔

یہ لوگ جس مشقت کی بات کرتے ہیں وہ بہت کم بھی ہے اور بڑی سہل بھی۔ کیا کسی ناواقف کو اسلام کے مسائل سکھانے یا ایک ایسے کافر کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں بہت زیادہ مشقت ہے، جس نے اسلام کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟ کیا اس سے بھی کوئی تھک جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اچھی باتیں نکالے؟ یا اگر کوئی اسلام کے بارے میں غور وفکر کرے تو اس کا دماغ بہت زیادہ تھک جائے گا؟ اسی طرح کیا ایک شخص اس صورت میں کسی ناقابل برداشت مشقت سے دوچار ہو جائے گا کہ اللہ نے وسائل دیے ہوں اور وہ بت پرستانہ معاشروں میں جا کر ان کو اللہ کی طرف بلائے؟

کیا یہ لوگ اہل کلیسا کو نہیں دیکھتے کہ وہ کئی کئی سال اپنے مشن کی راہ میں لگا دیتے ہیں؟ ایک مسلمان پر عیسائی مشنریوں سے بڑھ کر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کے مشن پر نکلیں اور ان بت پرستوں کے درمیان دعوت الی اللہ کو عام کریں۔

ایک مسلمان کے دل میں جب شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ وہ تھک جائے گا اور مشقت میں مبتلا ہو گا تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو یاد کرے کہ

اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ

[النساء ۴: ۱۰۴]

”اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔“

ایسے شخص کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رسول ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں بہت زیادہ تکلیفیں اٹھائیں، جن میں بعض کا ذکر ہم بطور مثال پیش کریں گے۔ سیرت کی کتابوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ جب غزوہ احد سے

واپس مدینے میں آئے تو اطلاع ملی کہ ابو سفیان اور اس کے مشرک ساتھی مدینے پر حملہ کر کے باقی لوگوں کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر پڑھی تو بلالؓ کو حکم دیا، اور انہوں نے اونچی آواز سے لوگوں کو پکارا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے دشمن کا تعاقب کرو، اور آج ہمارے ساتھ وہی شخص نکلے گا جو کل لڑائی میں شریک رہا ہو۔

حضرت سعد بن معاذؓ گئے اور اپنی قوم کو چلنے کا حکم دیا حالانکہ وہ سب زخموں سے چور تھے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے دشمن کا پیچھا کرو۔ یہ سن کر حضرت اسید بن حضیرؓ جن کے جسم میں سات زخم تھے اور وہ ان کا علاج کروانا چاہتے تھے، کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول کا حکم سر آنکھوں پر۔ پھر اٹھے، ہتھیار اٹھایا اور دوائی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ سے جا ملے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ بھی اپنے قبیلے میں گئے اور حضرت ابو قتادہؓ بھی ایک گروہ کے پاس گئے۔ سارے لوگ فوراً اکھٹے ہو گئے۔ بنو سلمہ میں سے چالیس افراد تھے جو زخموں سے چور تھے۔ طفیل بن نعمانؓ کے جسم پر ۱۳ زخم تھے، نجراش بن الصمہؓ کے جسم پر ۱۰ زخم تھے۔ اس حالت میں جب سارے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ بَنِيْ سَلَمَةَ: اے اللہ! بنو سلمہ پر رحم فرما۔

ایسے تھے رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ اور یہ ہے اعلائے کلمۃ اللہ کے راستے میں ان کے جہاد کا ایک نمونہ۔ پھر کیا جب ایک مسلمان دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دینے میں اپنے آپ کو تھوڑا سا تھکا دیتا ہے تو وہ اسے زیادہ خیال کرتا ہے؟ کیا اسے شرم نہیں آتی کہ وہ دعوت الی اللہ میں اپنی معمولی سی محنت کو بھی زیادہ خیال کرتا ہے، حالانکہ صحابہ کرامؓ زخم زخم جسموں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جنگ کے لیے نکلتے تھے اور کہتے تھے: اللہ اور اس کے رسول کا حکم سر آنکھوں پر؟!

وجوبِ دعوت الی اللہ کی وجوہات:

پچھلے صفحات میں ہم نے اس بات کے دلائل بیان کیے ہیں کہ دعوت الی اللہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسلام ایک مسلمان کے لیے صرف

یہ کافی نہیں سمجھتا کہ وہ بذات خود نیک اور ہدایت یافتہ ہو، بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیک بنانے والا اور سیدھے راستے پر لانے والا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ا۔ فریضۂ شہادتِ حق:

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو سارے لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا [الاعراف ۷: ۱۵۸]

"اے محمد! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔"

اور آپ ﷺ کی رسالت قیامت کے دن تک ہے۔ اس رسالت کا مقصد یہ ہے کہ ساری مخلوق خدا ہدایت سے سرفراز ہو کر دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ مند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت تم جہانوں کے لیے رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ [الاعراف ۲۱: ۱۰۷]

"اور اے نبی ﷺ! ہم نے تو تمہیں تمام جہان کے لوگوں کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کا پیغام پہنچایا اور اس حالت میں اپنے رب کے پاس چلے گئے کہ آپ ﷺ اپنے رب سے راضی اور آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ سے راضی۔ چنانچہ آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ پوری دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، ان کو ہدایت کے نور سے منور کرتے اور انہیں اندھیروں سے نکال کر اُجالوں کی طرف لے جاتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ [ابراہیم ۱۴: ۱]

"الف، لام، را، اے محمد ﷺ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے، اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

اسلام کو ماننے والے باقی مخلوق پر اللہ کے گواہ اور نبیؐ کے بعد لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [البقرۃ۲: ۱۴۳]

"اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

مسلمان جب دعوت الی اللہ کا کام انجام دیتا ہے تو یہ چیز اللہ کے بندوں کے لیے عظیم نفع اور تعاون کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ان کی طرف مہربانی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ وہ انہیں شرک اور بت پرستی کی نجاستوں سے نجات دلاتا ہے جس میں وہ پڑے ہوتے ہیں اور انہیں صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اوپر اپنے رب کا لازم کردہ حق ادا کر دیتے ہیں اور وہ مقصد حاصل کر لیتے ہیں جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [الذاریات ۵۱: ۵۶]

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

۲۔ کفر کا غلبہ اور اس کے اثرات:

زمین پر کفر و شرک کا باقی رہنا جلد یا بدیر پر اُن اسلامی تعلیمات پر اثر انداز ہوتا ہے جو دنیا کے کسی حصے میں قائم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ کفر کے علاقے میں رہیں۔ وہ انہیں حکم دیتا ہے کہ اسلامی ملک میں آجائیں، تاکہ فتنے میں مبتلا ہو کر دل کے مریض اور ایمان سے محروم نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا [النساء ۴: ۹۷]

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور ہو بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"

مفسرین اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کفار کے درمیان رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ دین پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے، جب کہ ان کے لیے ہجرت کا راستہ کھلا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور ایک ایسے کام کا ارتکاب کرتے ہیں جو بالاتفاق حرام ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس زمین کو چھوڑ دو جس میں ناجائز کام کھلم کھلا ہوتے ہیں اور ان میں کوئی پردہ نہیں کیا جاتا۔

اس بنا پر ایک مسلمان کا کفار و مشرکین کو اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف بلانا ان کے لیے مفید ہے اور یہ انہیں کفر کے شر سے بچاتا ہے۔

۳۔ ہلاکت اور عذاب سے بچاؤ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ [الانفال ۸: ۲۵]

"اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان منکر کو برداشت نہ کریں، ورنہ ان پر عام عذاب آجائے گا۔ یعنی وہ ایسا عذاب ہوگا کہ نیک وبدست اس کے لپیٹ میں آجائیں گے۔

صحیح مسلم میں زینب بن حجشؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاکت سے دوچار ہوں گے جب کہ ہمارے درمیان نیکوکار لوگ موجود ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، جب کہ برائی عام ہو جائے۔

داعی کی حالت وقدرت اور دعوت الی اللہ:

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ دعوت الی اللہ ہر مسلمان پر واجب ہے تو اب یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ فریضہ داعی کی حالت اور اس کی قدرت منحصر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کے وجوب کا دارومدار قدرت ہی پر ہے۔ جو شخص قدرت نہیں رکھتا اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی اور جو شخص قدرت رکھتا ہے اس پر وجوب اتنا ہی ہوتا ہے جتنی اس کی قدرت ہوتی ہے۔

قدرت کے مفہوم میں علم اور اختیار واقتدار آتے ہیں۔ چنانچہ ایک عالم پر ایک چیز واجب ہو گی اور وہی چیز جاہل پر واجب نہیں ہو گی۔ اسی طرح اختیار واقتدار رکھنے والے پر ایک چیز واجب ہو گی اور وہی چیز اختیار وقتدار سے محروم ایک عام مسلمان پر واجب نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم کو خصوصی وعید سنائی اور انہیں حق کے کتمان سے منع کیا جس کا انہیں علم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ [البقرۃ۲: ۱۵۹۔۱۶۰]

"جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآنحالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی

ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، انکو میں معاف کردوں گا اور میں بڑا اور در گزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم پر لازم کر دیا کہ اسلام کی جو تعلیمات ان کو معلوم ہو چکی ہیں انہیں بیان کر دیں اور انہیں لوگوں کے درمیان عام کریں تاکہ وہ شرک کی گندگیوں سے پاک ہو سکیں۔ جس کو اسلامی تعلیمات میں سے کسی بھی چیز کا علم ہو جائے تو اس چیز کی حد تک وہ عالم ہے اور اس پر لازم ہے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائے جو اس تعلیم سے بے خبر ہیں۔ اس لیے کہ علم کوئی ایسی اکائی نہیں ہے جس کی تقسیم اور تجزیہ نہ ہو سکے۔ علم ایک قابل تقسیم چیز ہے۔

جو مسلمان یہ بات جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ، اللہ کے رسول ہیں، اور قیامت کے دن حساب حق ہے، اور قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور نماز، روزہ، حج اور زکوۃ اسلام کے فرائض ہیں، تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اس علم کی تبلیغ کرے۔ مگر جو شخص ان چیزوں سے بھی بے خبر ہے تو وہ نہ ان کی تبلیغ کا مکلّف ہے اور نہ تعلیم کا، اس لیے کہ وہ خود لا علم ہے، اور جس کے پاس ایک چیز موجود نہ ہو وہ چیز وہ کسی کو نہیں دے سکتا۔

قدرت کی دوسری قسم، اختیار و اقتدار اور زمین میں حکومت ہے قرآن کریم نے اس قسم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس کے حامل لوگوں پر لازم کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے دے ہوئے اس اختیار واقتدار کو دعوت الی اللہ کی نشر واشاعت، اچھے کاموں کے ذریعے زمین کو آباد کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [الحج ۲۲: ۴۱]

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

زمین میں صاحب اقتدار لوگ کون ہیں؟اس کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ حکمران ہیں۔ بعض نے اس میں علماء کو بھی شامل کیا ہے مگر پہلی بات زیادہ واضح ہے۔

اس بناپر جس کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور اقتدار اعطا کیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ زمین کو اللہ کی عبادت سے آباد کرے، جس میں سر فہرست نماز ہے۔ اسی طرح وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، امر بالمعروف میں سر فہرست دعوت الی اللہ ہے اور نہی عن المنکر میں سر فہرست یہ ہے کہ لوگوں کو ہر قسم کے شرک سے روکے۔ یہی اس کی حکمرانی کا مقصود ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: امام کا تقرر اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ حکمرانی کا مقصد اصلی یہی ہے۔

ماضی میں جو لوگ حکمران بنے تھے انہوں نے یہ مفہوم پالیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اقتدار کو اللہ کے دین کو قائم کرنے اور اس کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مختلف صوبہ جات کے اپنے گورنروں کو ایک خط لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی اطاعت کا جو حکم نازل کیا ہے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی لوگوں کو پورے کے پورے اسلام کی طرف بلائے۔۔۔۔ لہٰذا تمہارا کام یہ ہے اسلام کی طرف دعوت دو اور اس کا حکم دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

[حم السجدۃ ۴۱: ۳۳]

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ حکمران کا فریضہ دعوت کو ادا کرنا بڑے اچھے اور موثر نتائج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لیے کہ وہ قوت اور اقتدار کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں امر اور نہی کا اختیار ہوتا ہے جس کی بناپر وہ رعایا کے عام افراد کی بہ نسبت نفاذ احکام کی زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے تو ایک مشہور قول ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ۔

"اللہ تعالیٰ حکمران کے ذریعے ان چیزوں کا قلع قمع کرتا ہے، جن کا قرآن سے نہیں کرتا۔"

جس قدر ایک مسلمان دعوت ونفاذ پر قادر ہوتا ہے اسی قدر دعوت الی اللہ میں اس کا فرض اور ذمہ داری ہوتی ہے۔

ہر وقت اور ہر حال میں دعوت:

ہم نے کہا ہے کہ دعوت الی اللہ مسلمان کا فریضہ ہے اور اسی اعتبار سے وہ اس کو ادا کرے گا۔ دعوت الی اللہ کے فریضے کے لیے نماز اور روزے کی طرح کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اس وجہ سے مسلمان اس فریضے کو ہر قسم کے حالات میں اور ہر وقت، جب بھی اس کا موقع ملے، ادا کرے گا۔

حضرت نوحؑ کے بارے میں خبر دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا۔۔۔ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا۔ ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا [نوح ۷۱: ۵، ۸۔۹]

"اس نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب وروز پکارا پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔"

اسی طرح ہمارے نبی حضرت ﷺ بھی دن رات اور چپکے چپکے اور علانیہ اپنی قوم کو دعوت دیا کرتے تھے۔ کوئی چیز بھی ان کو دعوت الی اللہ سے مشغول نہ کر سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ داعی جب اپنی دعوت میں سچا ہو تو وہ اس کا یہی مشغلہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر سوچ دعوت کے بارے میں ہوتی ہے اور اس کی ہر حرکت اسی کی خاطر ہوتی ہے۔ وہ اس کے راستے میں اپنے وقت اور صلاحیتوں پر بخل سے کام نہیں لیتا۔ کوئی کام اسے اس کام سے بے فکر نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ وہ سخت ترین لمحات اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

ہمارے رسول پاک حضرت ﷺ اسی طرح تھے۔ آپ ﷺ جس وقت مدینہ کی ہجرت فرمارہے تھے جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے تو راستے میں مکہ اور مدینہ کے درمیان آپ ﷺ سے بریدہ بن الحصیب الاسلمیؓ کی ملاقات ہوئی جو اپنی قوم کے قافلے کے ساتھ جارہا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس مشکل ترین وقت میں بھی دعوت الی اللہ سے غافل نہ تھے، حالانکہ آپؐ مکہ کو چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور آپؐ کی قوم کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام مظلومانہ طور پر جیل میں ڈال دیئے گئے مگر جیل اور اس کی تنگ و تاریک زندگی ان کو دعوت الی اللہ کے فریضے سے غافل نہ کر سکی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دو قیدیوں نے ان سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو اس موقع کو انہوں نے غنیمت جانا اور انہوں نے جواب دینے سے پہلے ان کو اللہ کی طرف بلایا۔ اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ہمارے سامنے بیان فرمایا ہے:

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ [یوسف ۱۲: ۳۹۔۴۰]

"اے زنداں کے ساتھیوں! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

داعی کی اصل ذمہ داری:

داعی سے جو کام مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دے، اور یہی اس کی ذمہ داری ہے۔ اس سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ لوگ مان کر بھی دیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ۔ [النور ۲۴: ۵۴]

"رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچادے۔"

جب رسول کی حالت یہ ہے کہ تبلیغ کے علاوہ کسی چیز کا مکلّف نہیں ہے تو امت کے افراد بطریق اولیٰ تبلیغ کے سوا کسی چیز کے مکلّف نہ ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ ایک اصولی قاعدہ ہے کہ انسان کسی اور کے فعل کا مکلّف نہیں ہوتا۔ یعنی کوئی اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ فلاں آدمی یہ کام کرے اور یہ کام نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا ہے۔ البتہ انسان اس بات کا مکلّف ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق سے متعلق اپنا فلاں کام کرے۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے ایسے فعل پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جیسے دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ چنانچہ انسان اس بات کا مکلّف ہے اور اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ معروف کا حکم دے۔

اب اگر مامور اس حکم کو مان لیتا ہے تو حکم دینے والے کا فعل مامور کے فعل کا سبب بن جاتا ہے مگر کبھی مامور اس حکم کو مان کر نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی (حضرت اسماعیلؑ) کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ:

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ [مریم ۱۹: ۵۵]

"وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔"

چنانچہ ایک مسلمان جس چیز کا مالک اور اس کا مکلّف ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں کو معروف کا حکم دے اور انہیں اللہ کی عبادت کی طرف بلائے۔ مگر وہ اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ دوسروں سے کوئی کام کروالے رہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مدعو سے داعی کی بات منوانا اور اسے ہدایت دینا ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے، کہ وہی ہادی ہے:

يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ [الفاطر ۳۵: ۸]

"جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

اللہ کو اپنے بندوں پر حجت بھی حاصل ہے۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا تھا، البتہ باقی سب جواب دہ ہیں۔ تبلیغ، بیان اور دعوت کی ہدایت تو رسولوں کی ذمہ داری بھی تھی اور ہر داعی کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ وہ اس کے مکلّف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کریم ﷺ سے فرماتا ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [الشوریٰ: ۴۲: ۵۲]

"یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔"

مگر اس کے ساتھ ایک اور آیت میں یہ اشارہ ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ [القصص ۲۸: ۵۶]

"اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

اللہ کی طرف مسلسل دعوت:

جب ایک مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دے اور اس سے یہ مطلوب نہیں ہے کہ لوگ ہدایت پا جائیں، تو اس کو چاہیے کہ بغیر کسی اُکتاہٹ کے، دعوت کا کام جاری رکھے، کیوں کہ اس کا کام بات پہنچانا اور اس کی وضاحت کرنا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے چاہیے کہ اس کام کو بھی ویسے ہی انجام دے جیسا کہ وہ دوسرے فرائض انجام دیتا ہے، اگرچہ کوئی بھی اس کی دعوت پر لبیک نہ کہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام کو نہیں دیکھتے کہ وہ اپنی قوم کو 950 سال تک اللہ کی طرف بلاتے رہے؟ اسی طرح تھے اللہ کے رسول وہ ساری زندگی لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے جن کی دعوت کو کسی ایک شخص نے قبول نہیں کیا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ایک مکلّف شخص سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس بات پر ساقط نہیں ہوتا کہ اس کے خیال میں امر بالمعروف کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر لازم ہوگا کہ اس فریضے کو ادا کرتا رہے۔ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کو نصیحت فائدہ ضرور پہنچاتی ہے اور اس کے ذمے جو کام ہے وہ امر و نہی ہے نہ قبولیت۔

اس قول سے استدلال کی توجیہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سر فہرست ہے۔ چنانچہ اس معنی کے لحاظ سے یہ قول بھی ہماری رائے کی تائید کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو علامہ سیوطیؒ نے بھی بیان کیا ہے۔

دعوت الی اللہ کو مسلسل جاری رکھنے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مایوسی کو حرام کیا گیا ہے اور اس بات کی امید رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی مان لے گا۔ اس لیے کہ معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور بندوں کے دل، رحمٰن کی انگلیوں میں ہوتے ہیں، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ داعی اس بات کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کوئی مان کر نہیں دیتا۔ چنانچہ اس پر لازم ہے کہ دوت اور وعظ وارشاد مسلسل جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ وہ کام انجام دے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

داعی کا اجر اللہ پر ہے نہ کہ بندوں پر:

اللہ کی طرف دعوت دینے والا ایک فریضہ ادا کرتا ہے اور اللہ کے حکم کے تحت ایک عبادت انجام دیتا ہے۔ عبادت کرنے والا عبادت کا اجر اپنے رب جلیل سے پاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فضل واحسان ہوتا ہے۔ چنانچہ داعی کسی بھی مخلوق سے اپنی دعوت کا اجر نہیں مانگتا، نہ مال کی صورت میں، نہ تعریف وتوصیف کی صورت میں، نہ جاہ ومنصب کی صورت میں اور نہ کسی دوسرے مادی یا معنوی عوض کی صورت میں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کے بارے میں فرمایا:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

[یونس ۱۰: ۷۲]

"تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔"

اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى [الشوریٰ ۴۲: ۲۳]

"کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔"

یعنی صرف یہی کہتا ہوں کہ میرے ساتھ اپنی رشتہ داروں کا ہی خیال کرو۔ مجھے دعوت الی اللہ کا کام کرنے دو اور مجھے اس سے منع کرنے کی کوشش نہ کر اور نہ دوسرے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کرو۔

یہ طریقہ کار اللہ کے سارے رسولوں کا تھا۔ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور ان سے کسی اجر یا قدردانی کے طالب نہ ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان کا اجر، اللہ کریم کے ذمے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْاَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ [یٰسٓ ۳۶: ۲۰۔۲۱]

"شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا: اے میری قوم کی لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کرلو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔"

اسلام میں داعی کا مقام:

اسلام میں داعی الی اللہ کا مقام بہت بلند ہے۔ دعوت الی اللہ کے راستے میں اس کی گفتگو اللہ کی ترازو میں، جو سب سے اچھی ترازو ہے، بہترین گفتگو ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

[حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۳]

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کسی کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

یہ آیت جیسا کہ مفسرین فرماتے ہیں، ان سارے لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہوتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، فرائض کو ادا کرتے ہیں اور حرام چیزوں سے بچتے ہیں۔

دعوت الی اللہ کے راستے میں اس کے کلمات، خصوصا اس وقت جب کہ اللہ سے انکار اور سرکشی عام ہو، روئے زمین پر بولے جانے والے سب سے بہترین کلمات ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کا کہنے والا ذاتی نیکی اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی صفات سے متصف ہو تو وہ روئے زمین کا بہترین شخص ہوگا۔

رہا داعی الی اللہ کے اجر کا معاملہ تو اس کا اجر بہت بڑا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ دَعَا اِلٰى هُدًى كَانَ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا۔

"جس نے کسی اچھی بات کی طرف دعوت دی اسے ان لوگوں کے برابر ثواب ملے گا جو اس کی پیروی کریں گے، اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

فَوَاللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا، خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ۔

"اللہ تعالیٰ تیرے ذریعے ایک شخص کو ہدایت سے نواز دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہت سی بہتر ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ: مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ اَجْرُ فَاعِلِهٖ

جس نے کسی بھلائی کے کام کی طرف رہنمائی کی اس کے لیے بھلائی کرنے والے کے برابر اجر ہے۔

منظّم دعوت:

دعوت اور تبلیغ کے دو طریقے ہیں۔ ایک منظّم اور جماعتی شکل میں اور دوسرا بغیر جماعت اور غیر منظّم طرز پر۔ یہ دونوں طریقے نتائج کے اعتبار سے یکساں نہیں بلکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ایک داعی اگر وسیع پیمانے پر توحید وسنت کی دعوت و تبلیغ کر رہا ہوتا ہے، لیکن اپنے کام اور متعلقہ افراد کو تنظیمی ڈھانچے اور جماعتی شکل میں منظّم کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اس کی دعوت ہے تو اس طرز دعوت سے اگرچہ وہ اپنی مسئولیت سے سبکدوش تو ہو جائے گا اور آخرت میں اسے بشرطِ اخلاص اجر بھی ان شاء اللہ ملے گا، لیکن یہ حکیمانہ اور مبصرانہ دعوت و تبلیغ نہیں اور نہ اس طرز تبلیغ کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں جو ایک صالح انقلاب اور ایک بہتر تبدیلی کے لیے پیش خیمہ ہوتا ہے۔اس کی بجائے محدود پیمانے پر مستقل، مسلسل جبکہ جماعتی شکل اور منظّم طرز پر دعوت و تبلیغ زیادہ حکیمانہ، زیادہ مفید اور زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے اور انقلاب اسی طرز دعوت سے آتا ہے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے زمین میں بیج اور تخم بونے کی مثال زیادہ مفید ہے، دعوت و تبلیغ دراصل ایک قسم کی تخم ریزی اور بیج بونا ہے۔ تخم ریزی اور بیج بونے کی دو صورتیں ہوتی ہے۔ایک صورت تخم ریزی کی وہ ہے جو تجربے اور سائنس سے ثابت ہے کہ وہ ہواؤں، جانوروں اور پرندوں کے ذریعے سے انجام پاتی ہے۔ ہوا، جانور اور پرندے بیج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں جس سے ہر طرح کے بیج ہر طرف زمین میں پھیل جاتے ہیں اور منتشر طور پر قسما قسم درخت از خود اگ آتے ہیں۔اس تخم ریزی کی پیداوار میں کوئی نظم نہیں ہوتا، نہ کوئی مستقل فصل ہوتی ہے، نہ اس کی کوئی باقاعدہ فصل کاٹی جاتی ہے اور نہ اس قسم کی پیداوار سے لوگوں کو وافر مقدار میں پھل پھول ملتے ہیں۔ تخم ریزی اور بیج بونے کی دوسری قسم یہ ہے جو کسان ایک خاص طریقے سے بوتا ہے۔ وہ ایک ہی زمین پر مسلسل محنت کرکے اسے تیار کرتا ہے، پھر ایک منصوبے کے مطابق اس میں بیج ڈالتا ہے، اسے پانی دیتا ہے اور اس کی خبر گیری کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ویسی ہی فصل تیار ہو جاتی ہے جیسی اُس کو مطلوب ہوتی ہے۔ایسی فصل کی باقاعدہ کٹائی ہوتی ہے لوگوں کو اس سے پھول، پھل اور غلہ ملتا ہے۔

الغرض داعی کو چاہیے کہ اپنی دعوتی تخم ریزی میں ہواؤں اور پرندوں کا سا غیر منظّم

طریقہ اختیار نہ کریں، بلکہ کسان کی طرح ایک منصوبے اور مسلسل محنت والا منظم طریقہ اختیار کریں۔ اکثر داعی توحید وسنت کا مسئلہ بیان تو کرتے ہیں، دعوت کا کام تو کر رہے ہوتے ہیں، قرآن کا درس بھی دیتے ہیں، لیکن اُن کے دروس میں نظم و اجتماعیت حوالے سے ذہن سازی نہیں ہوتی۔ جماعت کی اہمیت، شوریٰ کی ضرورت، اطاعت امیر پر بات نہیں ہوتی، وہ اپنے شاگردوں، متعلقین اور افراد کو تنظیم کی لڑی میں نہیں پروتے اور نہ انہیں داعی بناتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ صحیح العقیدہ اور متبع سنت تو بن جاتے ہیں، لیکن وہ آگے دعوت کا کام نہیں کر پاتے اور اگر دعوت کا کام کرتے بھی ہوں تو غیر منظم طریقے سے سرانجام دیتے ہیں جن سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

منظم دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ ہر رکن اپنے قریبی ماحول میں سے ایک حلقے کو منتخب کرکے باقاعدہ اپنے چارج میں لے کر اور اس کے اندر دعوت اور درس قرآن کا مسلسل اور منظم کام شروع کرے۔

پہلے وہ اساسی عقائد توحید وسنت اور اسلام کے بنیادی اصول، احکام اور اخلاق کی تفصیلات کی طرف بڑھے اور اس پر ایمان کی پختگی اور عمل کرنے کی تلقین کرتا رہے تاکہ ان کے اندر مکمل اعتقادی، اخلاقی اور عملی انقلاب رونما ہو جائے۔ اپنے عملی برتاؤ اور اپنی ہدایات ونگرانی سے اس کام کو آگے چلاتے رہیں۔ اس کے بعد انہی لوگوں کو خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی کم ہوں تنظیمی لڑی میں پرو کر دوسرے لوگوں میں اس طرز کی کاشت کاری اور دعوت کے لیے استعمال کرنا شروع کرے اور اپنی نگرانی ورہنمائی میں ان سے کام لے۔ اس طرح دعوت کا یہ حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا اور علاقوں کے علاقے اللہ کی تابعداری اختیار کرتے جائیں گے، لیکن اس کے لیے اصولِ دعوت، طریقہ دعوت کا جاننا اور حکیمانہ ومبصرانہ دعوت کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس سے جو نتائج بھی حاصل ہوں گے پائیدار ودیرپا ہوں گے، اور پھر یہ کاشت اضعافاً مضاعفہ کے تناسب سے پھیلتی چلی جائے گی۔

اس تناظر میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دروسِ قرآن بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو صرف ایک تقریر کی مانند عوام کو سنایا جاتا ہے یہ یک طرفہ عمل ہوتا ہے۔ اس سے آخرت کے ثواب کے ساتھ کچھ چھوٹا موٹا کام تو ہو جاتا ہے، لیکن مکمل طور پر مطلوبہ مقصد حاصل

نہیں ہوتا، جبکہ دوسری قسم کا درس قرآن وہ ہے جس میں تعلیم و تعلم کے طریقے پر دو طرفہ عمل ہوتا ہے۔ استاد پڑھاتا ہے شاگرد اور عوام سیکھتے ہیں اُن کے سامنے قرآن پاک ہوتا ہے۔ اُن پر سیکھنے سکھانے والی محنت ہوتی ہے، اُن کی مذکورہ بالا طریقے پر تربیت ہوتی ہے۔ اس درس قرآن سے نہ صرف مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں، بلکہ افراد دعوت کے کام کو اپنا کام تصور کرتے ہیں اور داعی بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس دوسرے طریقۂ درس کو اختیار کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض افراد دعوتی لحاظ سے زیادہ کامیاب ہیں اور بعض کم۔ بعض کا کام موثر ہوتا ہے خواہ تھوڑا ہو اور بعض کا اتنا موثر نہیں ہوتا خواہ زیادہ ہو۔ دعوت کا کام انفرادی و اجتماعی سطح پر استوار ہوتا ہے۔ شخصیات اور تنظیمات دونوں میں قدر مشترک چونکہ داعیانہ کردار ہے۔ تو اگر اس کردار کی جڑیں مضبوط ہوں تو دعوت کا کام شجرۂ سایہ دار کی طرح پھیلتا ہے۔ اس کردار کی جڑیں مضبوط ہونا دعوت کو موثر بنانے کے لئے ہے ہمارے نزدیک داعی میں مندرجہ ذیل خصوصیات کو تلاش کرنا اور پروان چڑھانا چاہیے۔

ذاتی انہماک:

بعض داعی افراد از خود متحرک، دعوتی درد رکھنے والے اور حق کو پھیلانے کے حریص ہوتے ہیں۔ وہ کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ کسی منزل کا تعین کر لیتے ہیں اور پھر اس کے لئے شب و روز کوشش کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا انفرادی کام بھی ایک بڑی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اپنے آپ کو جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ چونکہ ایسے افراد عمل پسند ہوتے ہیں، دعوت کا کام از خود کرتے ہیں اور اس میں کام چوری اور سستی سے کام نہیں لیتے لہٰذا ان کا کام اثر پذیر ہوتا ہے۔

بصیرت و علم:

بعض داعی افراد فکری و علمی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا ذہن اس دعوت کی حقیقت اور اس کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہوتا ہے، وہ موقع محل، حالات اور مخاطب کو دیکھ کر اُس کی مناسبت سے کام کرتے ہے۔ دعوت کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مسائل کا حل جانتے ہیں۔ لہٰذا حق ان کے بیان سے آشکارا ہوتا ہے۔ علم استدلال اور بلاغت کے ذریعے لوگوں کے اذہان اور قلوب کو متاثر کر لیتے ہیں۔

دوست مزاج:

بعض داعی دوست مزاج ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں میں میل ملاپ کرکے اُن ہی کے درمیان رہتے ہیں اُن کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، لوگوں سے تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا، خوشی ہو یا غمی، مشکل ہو یا آسانی وہ ہر موقع پر، ہر سطح پر، ہر صورت میں رابطہ بنانا، تعلق استوار کرنا اور اس تعلق کو دعوت کے لئے استعمال کرنا جانتے ہیں۔

انتظامی صلاحیت:

بعض داعی تنظیمی سطح پر منصوبہ سازی کے ذریعے اہداف متعین کرتے ہیں۔ کام کے لئے لائحہ عمل مرتب کرکے آگے بڑھانا جانتے ہیں۔ وہ کل کا کام کل آنے سے پہلے راتوں رات اس وجہ سے انجام دیتے ہیں کہ ممکن ہے کل زندگی وفا نہ کرے اور کام کی سعادت سے محروم رہ نہ جائیں۔ ان میں قیادت، فیصلہ سازی، معاملہ فہمی وغیرہ کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ وہ اپنی منظم دعوت سے تنظیمی واجتماعی قوت کو بروئے کار لاکر بڑے مقاصد اور اعلیٰ اہداف کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔

تربیت یافتہ:

داعی کے لئے ایک ضروری صفت یہ بھی ہے کہ وہ دعوت کے میدان میں کودنے سے پہلے تربیت دعوت حاصل کرچکا ہو۔ ورنہ بغیر تربیت کے خیر کی بجائے شر پھیلانے کا سبب بنے گا۔ کیونکہ دعوت ایک فن ہے۔ اس کے کچھ اصول، قواعد اور ضوابط ہیں۔ اس کے لوازم اور تقاضے ہیں، دعوت الی اللہ کے میدان میں اترنے سے پہلے ان تمام تقاضوں اور اصول وضوابط پر عبور حاصل کرنا، یعنی اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ خود دعوت الی اللہ فرض ہے۔ ان تمام امور سے باخبر ہونے کے بعد ان کے ایک ایک طور طریقے اور ضابطے کا لحاظ رکھنا ہوگا، ان کا لحاظ کئے بغیر نہ صرف یہ کہ دعوت کے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کئے جاسکیں گے، بلکہ داعی کی تمام تر جدوجہد کا نتیجہ برعکس اور دعوتی نقطہ نگاہ سے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

اب ہر داعی اور رکن دعوت کو آگے بڑھانے کے لئے داعیانہ کردار کی یہ خصوصیات اپنا کر اسی کے تناظر میں دعوت کو آگے بڑھانا چاہیے۔

باب:۳

زادالمبلغ

اللہ تعالیٰ نے جس کو علم کی دولت سے نوازا ہے اس سے یہ پختہ وعدہ بھی لیا ہے کہ وہ اس علم کو چھپائے بغیر لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔

[آلعمران: ۱۸۷/۳]

" اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتے رہنا اور اس (کی کسی بات) کو نہ چھپانا۔ "

اللہ تعالیٰ کا لیا ہوا یہ وعدہ کوئی ایسا وثیقہ نہیں ہے جو لکھا جاتا ہے اور اس پر گواہ بنائے جاتے ہیں بلکہ یہ ایسا وثیقہ ہے جس کا ہر اہل علم کو بخوبی علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وثیقہ و وعدہ کے ذریعے اپنی عطا کردہ دولت علم کے بارے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ اس وثیقہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہر اس مرد و عورت سے جس کو علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے، پختہ وعدہ لیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے متعلق اپنے علم کو ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں تک پہنچاتا رہے گا۔

داعی الی اللہ کے لیے لائحہ عمل (زادراہ) کیا ہے...؟ ہر مسلمان کا زادراہ وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان میں بیان کر دیا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ [البقرۃ: ۱۹۷/۲]

" اور زادراہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادراہ پرہیزگاری ہے "۔

ہر مسلمان کا زادراہ " تقویٰ " ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں (حکم دیتے ہوئے) بار بار ذکر فرمایا ہے اور اس شخص کی تعریف فرمائی ہے جو اس کا اہتمام کرے، اور اللہ کریم نے اس کے ثواب کو بیان فرماتے ہوئے بات کرنے کے اسلوب کو بھی ذکر کیا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلاَّ اللّٰہُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۔ [آل عمران: ۳/۱۳۴، ۳۳]

" اور دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین وآسمان جیسی ہے اور وہ ان لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کرکے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی (گڑگڑا کر) معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لئے"۔

تقویٰ کیا ہے؟

معزز بھائیو!۔۔۔ کبھی کبھی تم کہا کرتے ہو کہ "تقویٰ" ہے کیا؟ "تو اس کا جواب سیدنا طلق بن حبیب رحمہ اللہ کا وہ اثر ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے: " تقویٰ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روشنی (ہدایت) کے مطابق ثواب کی امید پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام کرے اور اللہ تعالیٰ کی سزا و عذاب سے ڈرتے ہوئے اس کی عطا کردہ ہدایت کی روشنی میں اس کی منع کردہ باتوں کو ترک کردے"۔

اس عبارت میں علم، عمل، ثواب حاصل کرنے اور سزا کے خوف کو جمع کر دیا گیا ہے، پس یہی تقویٰ ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ داعی الی اللہ کے لیے دوسرے لوگوں کی نسبت انتہائی ضروری ہے کہ وہ پوشیدہ اور ظاہری دونوں حالتوں میں "اللہ سے ڈرنے" کی صفت سے آراستہ

ہو۔ اور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس جگہ وہ تمام صفتیں ذکر کر رہا ہوں جو دعوت دین کے کام کرنے والے ایک داعی سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کو زادراہ بنانا اس کے لیے ضروری ہے۔

داعی الی اللہ کی پہلی صفت "علم":

جس بات کی وہ دعوت دینا چاہتا ہے اس کے متعلق اس کو بالکل صحیح علم حاصل ہو جو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہو، کیونکہ جو بھی علم ان دو چشموں کے علاوہ حاصل کیا جائے گا، وہ قابل موازنہ ہے یا تو پہلے یا پیش کرنے کے بعد۔ کیونکہ وہ یا تو قرآن وسنت کے موافق ہوگا یا مخالف۔ اگر موافق ہوگا تو اس کو قبول کیا جائے گا اگر مخالف ہوگا تو اس کو رد کرنا واجب ہے خواہ کہنے والا کوئی بھی ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

[النور: ۲۴/۶۳]

" رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ (دنیا میں) وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں (یعنی کوئی مصیبت ان پر آن پڑے) یا (آخرت میں) ان پر دردناک عذاب نہ آجائے"۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" کیا تو جانتا ہے فتنہ کیا ہے؟ فتنہ سے مراد شرک ہے، شاید کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تردید کی جائے تو اس کے کرنے والے کے قول میں کجی واقع ہو جائے اور وہ ہلاک ہو جائے۔" [کتاب التوحید: ۲۹۹]

جاہل اور جاہل مرکب میں فرق:

سب سے پہلی بات جو داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کے مطابق علم پر کما حقہ حاوی ہو۔ کیونکہ بلا علم دعوت دینا جہالت کی دعوت دینا ہے اور جہالت کی دعوت کا نقصان اس کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ ایسا داعی اپنی ذات کو قابل توجہ اور رشد وہدایت کا علمبردار سمجھتا ہے اور جب وہ خود جاہل ہے تو وہ گمراہ ہونے والوں اور گمراہ کرنے والوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!!

العیاذ باللہ (اللہ کی پناہ اس سے) اس کی یہ جہالت جہل مرکب ہے اور جہل مرکب جہل بسیط (سادہ) سے زیادہ سخت ہوتی ہے کیونکہ جہل بسیط صرف اپنے صاحب کو ہی رشد وہدایت سے روکتی ہے اور اس میں جاہلانہ کلام نہیں ہوتا اور یہ علم حاصل کرنے سے رفع ہو جاتی ہے لیکن جاہل مرکب میں مشکل پر مشکل ہے کیونکہ وہ خاموش نہیں ہوتا بلکہ باتیں کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ جہالت کی ہی ہوں نتیجتاً وہ روشن دل کی بجائے تاریک دل ہو جاتا ہے۔

تین کاموں میں بصیرت ہونی لازمی ہے:

اے میرے داعی بھائیو!۔۔۔ علم کے بغیر اللہ کی طرف بلانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی طرف دھیان کرو کہ اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ [یوسف: ۱۲/۱۰۸]

"اے رسول! کہہ دیجیے میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، میں اور میری پیروی کرنے والے (صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین) سمجھ بوجھ کے ساتھ اس پر قائم ہیں"۔

اے داعی الی اللہ!۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان {علی بصیرۃ} پر غور کر۔ داعی اور مبلغ کو تین امور کی بصیرت ضرور حاصل ہونی چاہیے:

۱: جس حکم شرعی کی وہ دعوت دے اس کے بارے میں اسے پورا پورا علم ہو۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے گمان کی بنا پر کسی حکم کو واجب سمجھ کر دعوت دے، حالانکہ وہ حکم شریعت الٰہی میں غیر واجب ہو... اس لحاظ سے وہ بندوں پر کسی غیر لازم حکم کو لازم کر دے گا... اسی طرح وہ کسی چیز کو حرام سمجھ کر، چھوڑنے کا حکم دے دے حالانکہ وہ چیز اللہ کے دین میں حرام نہ ہو... تو یوں وہ بندگان رب العزت پر حلال چیز کو حرام کر دے گا۔

۲: جس کو دعوت دی جا رہی ہے اس کے حالات سے بھی کما حقہ، بصیرت وواقفیت ہونی

چاہیے۔ اسی لیے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو اُن کو فرمایا:

اِنَّكَ سَتَأْتِيْ قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ لِيَعْرِفَ حَالَهُمْ وَيَسْتَعِدَّ لَهُمْ

" تو اہل کتاب کے ایسے لوگوں کے پاس جانے والا ہے جن کے حال کو تمہیں جاننا چاہیے اور ان کے لیے تیاری کرنی چاہیے "۔

لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے اس کی بساط علمی کیا ہے؟ اور اس کی بحث وجدل کی کیفیت کیسی ہے؟ تاکہ تو اس کے لئے تیار ہو سکے اور (حق کو واضح کرنے کے لئے) اس سے بحث و تکرار کر سکے۔ کیونکہ جب تو اس کو بحث و تکرار میں مصروف کر دے گا اور اس سے (بحث کرنے) کی تجھ میں کما حقہٗ ہمت و طاقت ہو گی تو اس صورت میں حق کی عظیم فتح ہو گی، جس کا سبب (اے داعی!) تو ہو گا۔ اور یہ خیال نہ کرنا کہ باطل کا خو گر ہر حال میں سرنگوں ہو کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضُكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِيْ لَهٗ بِنَحْوِمَّا اَسْمَعُ۔ [بخاری: کتاب الاحکام، مسلم: کتاب الاقضیۃ]

" تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو پیش کرنے میں سچے آدمی سے زیادہ تیز طرار ہو، پس میں تو اپنے سننے کے مطابق ہی فیصلہ کروں گا"۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دعویٰ دائر کرنے والا (اگرچہ جھوٹا ہی ہو) اپنی دلیل پیش کرنے میں سچے آدمی سے زیادہ تیز طرار ہو سکتا ہے اور فیصلہ تو اسی جھگڑالو کی بات چیت کے مطابق ہی ہو گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ داعی مدعو کے حالات سے واقف ہو۔

۳: دعوت پیش کرنے کے انداز و کیفیت سے بھی داعی کو بصیرت حاصل ہونی چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

[النحل:۱۲۵/۱۶]

"اے نبی! آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دیتے رہیے اور (جب کبھی بحث کا موقع آئے تو) ان سے بہترین طریقہ سے بحث کیجیے"۔

کچھ لوگ برائی کو دیکھ کر۔۔۔اس میں کود پڑتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے انجام کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔۔۔نہ تو اپنے اکیلا ہونے کے بارے میں اور نہ اس (مدعو) کے متعلق اور نہ حق کی طرف بلانے کی مثالوں کی طرف دھیان کرتے ہیں۔لہٰذا داعی کے لئے ضروری ہے کہ جوش میں آنے سے پہلے اس کے نتائج کی طرف دیکھے۔میرے داعی بھائیوں کو حکمت اور موعظت کا استعمال بہت محبوب ہونا چاہیے اور اگر کسی معاملہ میں تھوڑی سی دیر بھی ہو گئی تو انشاء اللہ انجام بہت عمدہ ہوگا۔

کیا علم کے خزانے کے بغیر دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے؟:

جب داعی الی اللہ کا زاد راہ صحیح علم ہوگا جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہو، تو یہی بات شرعی نصوص کی رو سے مطلوب و مقصود ہے اور یہی بات واضح عقلی دلائل کی جان ہے کیونکہ اس میں شبہات و شہوات کی آمیزش نہیں ہوتی۔

آپ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کی طرف کیسے دعوت دے سکتے ہیں، جبکہ آپ اس کا طریقہ (راستہ) ہی نہ جانتے ہوں، اگر آپ شریعت الٰہی کو جانتے ہی نہ ہوں تو پھر صحیح داعی کیسے بن سکیں گے؟

ہمارا یہی مقصد ہے کہ داعی کے پاس اس کا علم موجود ہو، ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ بہت زیادہ علم حاصل کرکے دعوت کے میدان میں اترے، صرف یہ مقصد ہے کہ جو کچھ وہ بیان کرے اس کے متعلق اسے پورا پورا علم ہو اور جو وہ نہ جانتا ہو اس کے متعلق بات نہ کرے۔

دوسری صفت "صبر":

داعی کے طریق کار کی دوسری صفت یہ ہے کہ...

۱: وہ اپنی دعوت...پر صبر کرنے والا ہو۔

۲: جس کی طرف وہ دعوت دیتا ہے اس پر بھی صبر کرنے والا ہو۔

۳: اس کی دعوت پر جو اعتراض ہوں، اس پر بھی صبر کرنے والا ہو۔

۴: دعوت کے دوران پیش آمدہ جن تکالیف کا اسے سامنا پڑے، اس پر بھی صبر کرنے والا ہو۔

دعوت پر صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے کام پر ہمیشگی اختیار کرے، اسے منقطع نہ ہونے دے اور نہ ہی اس سے اکتائے بلکہ اپنی دعوت مسلسل جاری رکھے (جتنی اس میں استطاعت ہو) اور مختلف میدانوں میں دعوت نفع بخش، قدرے بہتر اور زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ دعوت کے کام پر صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے اکتائے نہیں، کیونکہ اکتا جانے کی صورت میں انسان حسرت زدہ ہو کر دعوت کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ لیکن جب وہ باقاعدگی کے ساتھ اس کام کو کرتا رہے گا تو ایک طرف تو وہ صابرین کے اجر کا مستحق ہوگا اور دوسری طرف وہ بہترین انجام پائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا ہے اسے غور سے سنیں:

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ۔ [ھود:۱۱/۴۹]

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! غیب کی خبروں میں سے یہ چند خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان خبروں سے نہ آپ واقف تھے اور نہ ہی آپ کی قوم (اے رسول کافروں کی ایذا رسانیوں پر) آپ صبر کیجیے (کافروں کا انجام اچھا نہیں ہوگا) اچھا انجام تو متقی لوگوں کا ہوتا ہے"۔

انسان کو اپنی دعوت پر ہونے والے اعتراضات اور جھگڑوں پر بھی صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو انسان بھی دعوت الی اللہ کا کام کرے گا اس پر اعتراضات ضرور ہوں گے حتی کہ انبیاء بھی اس سے نہ بچ سکے۔ فرمان الٰہی ہے:

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا۔

[الفرقان: ۳۱/۲۵]

" اور (اے رسول جس طرح یہ کافر آپ کے دشمن ہیں) اسی طرح مجرموں کو ہم نے ہر نبی کا دشمن بنایا تھا (اور اے رسول) آپ کا رب ھادی اور مددگار ہونے کے لحاظ سے آپ کے لئے کافی ہے۔"

ہر سچی دعوت کے مخالفین ضرور ہوتے ہیں اور اس کے آگے رکاوٹوں، جھگڑوں اور مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں داعی پر واجب ہے کہ وہ اپنی دعوت پر پیش ہونے والے اعتراضات پر صبر کرے۔ حتی کہ اس کی دعوت کو غلط اور باطل ہی کیوں نہ خیال کیا جائے، لیکن اگر وہ جانتا ہے کہ اس کی دعوت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضوں کے مطابق ہے تو اس کو ہر حال میں اس پر صبر کرنا چاہیے۔ سید اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ اپنے گہرے دوست مولوی رستم علی کے ساتھ چاندنی چوک میں سے گزر رہے تھے کہ ایک پہلوان نے سید صاحب کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس پر مولوی رستم علی صاحب کو غصہ آگیا اور تلوار نکال کر اسے مارنے دوڑے۔ سید صاحب نے جھپٹ کر مولوی رستم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور فرمایا کہ:

" میاں رستم علی! کیا کرتے ہو؟ وہ گالیاں بے جا تو نہیں دیتا بلکہ وہ ٹھیک کہتا ہے، کیونکہ وہ یہی کہتا ہے کہ " یہ (مولوی اسماعیل) بڑا بد دین ہے جو نئی نئی باتیں نکالتا ہے" سو اس میں وہ کیا بے جا (بری بات) کہتا ہے؟ میری باتیں تو اس کے لیے واقعی نئی ہیں۔ علماء نے یہ باتیں ان بے چاروں کو کہاں سنائی ہیں، پھر اس کو نئی کیوں نہ معلوم ہوں اور وہ گالیاں کیوں نہ دے۔" سید شہید رحمہ اللہ کی اس بات کا اس پہلوان پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس دن سے آپ کا دوست بن گیا۔ [روایات الطیب]

اس واقعہ میں صبر، حکمت، دانائی سب چیزیں واسباق یکجا جمع ہیں۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس کی بات اگر حق کے خلاف ہو (اور اسے پتہ بھی چل جائے) تو بھی اپنی بات اور اپنی دعوت پر اڑا رہے، کیونکہ حق بات ظاہر ہو چکنے کے بعد جو داعی اپنی غلط بات پر اڑا رہتا ہے تو وہ

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مصداق ہوگا:

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ ۔ [انفال:۶/۸]

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ لوگ حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد حق کے معاملہ میں آپ سے بحث کر رہے تھے گویا کہ ان کو ان کی آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا۔"

حق ظاہر ہو جانے کے بعد اس میں جھگڑا کرنا ایک مذموم صفت ہے اور اس سے متصف ہونے والے کے بارے میں ارشاد رب العزت ملاحظہ فرمائیں:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ [النساء:۱۱۵/۶]

"اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مؤمنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر چلے تو ہم اسے ادھر ہی جانے دیں گے جس طرف جانے کیلئے اس نے رخ پھیر لیا ہے۔ پھر ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔"

اے داعی!۔۔۔ اگر تیری دعوت پر کوئی صحیح اعتراض کیا جائے تو تجھ پر رجوع کرنا، (مان لینا) ضروری اور واجب ہے اور اگر اعتراض باطل اور غلط ہو تو تیری دعوت کے جاری رہنے میں ذرہ بھر بھی ڈگمگاہٹ نہیں آنی چاہیے۔

دعوت کے نتیجے میں انبیاء پر مصائب کے پہاڑ:

اسی طرح داعی کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں پیش آمدہ تکالیف پر بھی صبر کرنا چاہیے کیونکہ داعی کو لازمی طور پر قولی اور فعلی تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے حتی کہ پیغمبروں کو بھی قولی اور فعلی تکالیف دیے گئے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ جل شانہ کا فرمان پڑھیں:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ۔

[الذاریات:۵۲/۵۱]

"یونہی ہوتا رہا ہے کہ ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔"

آپ کیسا محسوس کریں گے؟ کہ جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے وحی آتی ہو

اور اس کے منہ پر کہا جائے کہ "تو جادو گر یا دیوانہ ہے" لازماً اس کو تکلیف ہوتی ہو گی۔ اس کے باوجود پیغمبروں نے لوگوں کی تکلیف دہ باتوں پر صبر کیا اور ان کے تکلیف دہ افعال پر بھی صبر کا مظاہرہ کیا۔ سب سے پہلے پیغمبر نوح علیہ السلام کی طرف دیکھیں کہ کشتی بناتے وقت ان کی قوم ان کے پاس سے مذاق کرتے ہوئے گزرتی تو آپ جواب میں کہا کرتے:

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ [ھود: ۱۱/۳۹،۳۸]

"جب نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی) تو جب کبھی ان کی قوم کے سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے، تو وہ ان کے مذاق کے جواب میں کہتے) اگر تم اس وقت ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو (ایک وقت آنے والا ہے جب) ہم تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے جس طرح تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کرنے والا عذاب کس پر نازل ہوتا ہے اور ہمیشہ کے عذاب میں کون مبتلا ہوتا ہے۔"

اور معاملہ صرف مذاق کرنے پر ہی موقوف نہ ہوا بلکہ قوم نے آپ کو قتل کی دھمکیاں بھی دیں، ملاحظہ فرمائیں:

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ [الشعراء: ۲۶/۱۱۲]

انہوں نے کہا: "اے نوح! اگر تم تبلیغ کرنے سے باز نہ آئے تو پھر سنگسار کر دیے جاؤ گے۔"

یعنی تجھے پتھر مار مار کر قتل کر دیں گے۔ قتل کی دھمکی دیے جانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دھمکیاں دی گئیں (اپنی عزت وغلبہ کو ظاہر کرتے ہوئے) کہنے لگے کہ ہم نے تیرے سوا اور بہت سے رسولوں کو رجم کر دیا ہے، تو تم بھی تو انہی میں سے ہو، لیکن ان تمام دھمکیوں کے باوجود دعوت کے سلسلہ میں نوح علیہ السلام کے پائے ثبات میں ذرہ لغزش نہ آئی، بلکہ آپ نے اپنی دعوت کو جاری رکھا، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کے اور آپ کی قوم کے درمیان فیصلہ فرما دیا۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کو لیجیے کہ آپ کی قوم نے (آپ کی دعوت کا یکسر) انکار کرتے ہوئے آپ کا مقابلہ کیا بلکہ لوگوں میں آپ کو یوں مشہور کر دیا:

قَالُوْا فَأْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۔ [الانبیاء:۶۱/۲۱]

" قوم کے لوگوں نے کہا تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے، تاکہ لوگ دیکھ لیں"۔

پھر ان کو زندہ جلا دینے کی دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگے:

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۔ [الانبیاء:۶۸/۲۱]

قوم کے لوگوں نے کہا:

"اگر تمہیں کچھ کرنا (ہی) ہے تو اس (ابراہیم) کو آگ میں جلا ڈالو اور (اس طرح) اپنے معبودوں کی مدد کرو۔"

لہٰذا انہوں نے بہت بڑی آگ جلائی اور انتہائی حرارت اور دوری کے باعث آپ کو منجنیق کے ذریعے اس میں پھینک دیا، لیکن رب العزت نے آگ کو حکم دے دیا:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔ [الانبیاء:۶۹/۲۱]

ہم نے کہا: "اے آگ! ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور موجب سلامتی بن جا"۔

چنانچہ آگ آپ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی اور آپ اس سے بچ نکلے اور انجام کی بہتری ابراہیم علیہ السلام کے حصہ میں آئی۔ ادھر جناب موسیٰ علیہ السلام کو (دعوت حق دینے کے جرم میں) فرعون نے قتل کی دھمکی دیتے ہوئے کہا:

ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔

[المؤمن:۲۶]

" چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ (اپنی دعوت و تبلیغ سے) تمہارا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔"

فرعون نے آپ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی تو دے دی لیکن آخر کار انجام خیر موسیٰ علیہ السلام کے حصہ میں آیا۔ اب عیسیٰ علیہ السلام کا حال سنیں، کہ آپ کو انتہائی اذیتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ یہود نے آپ پر زانیہ کا بیٹا ہونے کی تہمت لگا دی اور اپنے زعم باطل میں آپ کو قتل بھی کر ڈالا لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتے ہیں:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ

اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ [النساء: ۱۵۸/۴، ۱۵۷]

انہوں نے کہا: "ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ پھانسی دی بلکہ ان کے لئے (کسی دوسرے آدمی کو عیسیٰ علیہ السلام کی) شبیہہ دے دی گئی (انہوں نے اس شبیہہ کو قتل کیا نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو) بیشک جو لوگ اب بھی ان کے قتل کے متعلق اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ شک وشبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اس سلسلہ میں مطلق کوئی علم نہیں وہ محض وہم وگمان کی پیروی کر رہے ہیں (یقینی علم تو اللہ کو ہے اور وہ بتا رہا ہے کہ) یقیناً ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا (اور یہ کام اللہ کے لئے کیا مشکل ہے) وہ غالب ہے (ہر کام کر سکتا ہے اور وہ) حکیم ہے (ان کا زندہ اٹھانا اللہ کی مصلحت وحکمت پر مبنی ہے)"۔

ادھر انبیاء کے امام، خاتم الرسل اور بنی آدم کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ [الانفال: ۳۰/۸]

"اور جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے (اور اے رسول!) اس وقت کو یاد کیجیے جب کافر آپ کے لئے خفیہ تدبیریں کر رہے تھے کہ یا تو آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر داعی کو تکلیفیں ضرور پہنچیں گی [داعی جب اللہ کریم کے راستے میں مشکلات وتکالیف کو بغیر اُف کیے، بغیر کسی شکوہ وشکایت کے خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے، مصیبتوں، تکلیفوں پر صبر کرتا ہے، دل برداشتہ ہونے کے بجائے راہ حق سے بھٹکے ہوئے اور منحرف افراد کو دعوت دینے میں اپنا مال خرچ کرتا ہے اور وقت صرف کرتا ہے۔ زبان نبوت سے ایسے داعیوں پر رشک کرنے کے پاکیزہ جذبات اور ترغیبات صادر ہوئی ہیں۔ ایسے ہی داعیوں کے لیے رسول رحمت نے فرمایا ہے:

"قابل رشک تو صرف دو آدمی ہیں: (۱) ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ مال عطا فرمائے اور وہ اسے حق کی راہ میں لٹائے۔ (۲) اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ حکمت جیسی نعمت سے نوازے اور وہ اس کے ذریعہ لوگوں میں فیصلہ کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم (ودعوت) دے۔"

[بخاری: کتاب العلم]

لہٰذا اس کو ان پر صبر کرنا چاہیے۔ اس میں ہی کامیابی ہے۔

فرمان الٰہی سے دقیق نکتہ:

اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا۔ [دھر: ۷/۳۳]

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے (آہستہ آہستہ) نازل کیا ہے۔"

امید کی جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے بعد یوں ارشاد فرمائے گا کہ:

"اس قرآن کے نازل کیے جانے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کریں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو یوں ارشاد فرمایا: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۔ [دھر: ۷۶/۲۴]

"لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو"۔

(اس آیت میں) اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو کوئی بھی اس قرآن کو لے کر کھڑا ہوگا (اس کی دعوت دے گا) تو اس کو ایسے امور سے دوچار ہونا پڑے گا جن پر انتہائی صبر کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ صبر کرنے والا ہو اور اپنی دعوت کو مسلسل جاری رکھنے والا ہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے حق میں فیصلہ کر دے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ الٰہی فیصلہ اس کی زندگی میں ہی ہو جائے بلکہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی دعوت اس کے بعد لوگوں میں واضح ہو جائے اور اس کی پیروی کی جانے لگے۔ لہٰذا شخصیت ضروری نہیں بلکہ دعوت ضروری اور مقصود ہے۔

مرنے کے بعد بھی زندہ رہنے والے:

پس جب کسی کی دعوت باقی ہے اگرچہ اس کی موت کے بعد ہی کیوں نہ ہو تو وہ زندہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ [الانعام: ۱۲۲/۶]

"اے رسول! ان کافروں سے سوال کریں کہ بتاؤ) کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا، پھر ہم نے اسے نور عطا فرمایا، جس کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس جیسا ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو، پھر ان میں سے نکل نہ سکتا ہو (ہر گز نہیں، کافر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ) جو عمل یہ کافر کر رہے ہیں ان اعمال کو ان کے لئے مزین کر دیا گیا ہے (وہ اعمال ان کو برے ہی نہیں معلوم ہوتے تو چھوڑیں کیسے)"۔

حقیقت میں داعی کی زندگی کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ اس کے جسم میں روح باقی رہے بلکہ اس کے مقالات (دعوت کے پروگرام اور اس کی دعوت کے مثبت اثرات) کا لوگوں میں باقی رہنا اس کی زندگی کا دوام ہے۔ (یعنی مرنے کے بعد اس کی دعوت کے اثرات کا زندہ رہنا ہی اس کو دنیا میں زندہ رکھتا ہے)۔

ہرقل (شاہ روم) کے ساتھ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے خطاب پر غور فرمائیے۔ جب وہ اس کے پاس ۷ھ میں آئے اور ہرقل کو ان کے آنے کا پتہ چلا۔ ہرقل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (مکہ سے نکلنے) کا پتہ چل چکا تھا۔ تو اس نے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا۔ آپ کی ذات بابرکت، اور آپ کے نسب وخاندان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا۔ جب سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ہرقل کے سوالات کا جواب دیا تو ہرقل نے متاثر ہو کر یوں کہا: "اگر تیرا بیان سچ ہے تو جلد ہی وہ (آپ کا پیغمبر) میرے اس شاہی تخت وتاج کا مالک بن جائے گا"۔ [بخاری: کتاب بدء الوحی، مسلم: کتاب الجہاد]

سبحان اللہ! کون تصور کر سکتا تھا کہ (لوگوں کے کہنے کے مطابق) ایک ذی رعب اور

حکمران بادشاہ اس جیسے الفاظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتا اور وہ بھی اس وقت جبکہ جزیرہ عرب ابھی شیطان کے پنجے اور اس کے تسلط سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ جب ابو سفیان ہرقل کے دربار سے نکلے تو اپنی قوم سے کہنے لگے کہ "ہرقل نے ابن ابی کبشہ کو ایک بڑی عظیم بات کی خبر دی ہے۔"

آخر کار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شخصیت سے نہیں، بلکہ اپنی دعوت سے ہرقل کے ملک روم کے مالک بن گئے کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس سرزمین میں آئی تو بت پرستی، شرک اور اہل شرک سب کے سب غارت اور فنا ہو گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین اس سرزمین کے مالک بن گئے۔۔۔ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و شریعت کی برکت سے۔

جب داعی اپنی دعوت میں بالکل مخلص اور سچا ہوگا اور صبر کا مظاہرہ کرے گا تو انجام کی خیر و بھلائی اس کا مقدر ہو گی، خواہ اس کی زندگی میں ہو خواہ اس کی موت کے بعد ہو۔

تیسری صفت "حکمت":

داعی الی اللہ میں تیسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ اپنی دعوت میں حکمت کے پہلو کو سرفہرست رکھے کیونکہ یہ بغیر حکمت والی دعوت سے زیادہ موثر اور کارگر ہے۔ [حکمت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ مخاطب سے ہر طرح کی جارحیت کے باوجود نہایت صبر و حوصلہ سے نمٹا جائے نہ کہ کہا جائے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ اس کے اثرات اچھے نہیں برآمد ہوئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کریم نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر جو ثواب عطا کرتا ہے، وہ سختی پر عطا نہیں کرتا اور نہ نرمی کے سوا کسی اور شے پر عطا کرتا ہے۔ [مسلم: کتاب البر والصلۃ]

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کریم نرمی فرمانے والا ہے اور تمام امور میں نرمی پسند فرمایا ہے"۔

[بخاری]

بہر حال دعوت کا پہلا گر "حکمت" دوسرا "اچھی نصیحت" اور تیسرا "اور زیادتی نہ

کرنے والوں سے اچھے اور سلجھے انداز میں بحث"، پھر ظالم سے "بحث مباحثہ"۔ یہ دعوت دینے کے چار مراتب ہوئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

[النحل:۱۲۵/۱۶]

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دیتے رہیے اور (جب کبھی بحث کا موقع آئے تو) ان سے بہترین طریقہ سے بحث کیجیے"۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ۔

[العنکبوت:۴۶/۲۹]

" اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔"

حکمت کیا ہے؟

تمام امور کو عمدگی سے انجام دینا حکمت ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ تمام امور کو ان کے مراتب کے مطابق انجام دے اور ان کے اصل مقامات پر رکھے۔ حکمت میں یہ نہیں کہ تو جلد بازی کرے اور لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اپنی حالت سے بدل کر عصر سے صبح تک کے وقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی سی حالت پر آجائیں۔ جو شخص اس بات کا متمنی ہو وہ عقلی طور پر بے وقوف ہے اور حکمت کے وصف سے کورا ہے، اور اللہ کی حکمت بھی اس بات کا انکار کرتی ہے کہ یہ کام اس طرح ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب وشریعت آہستہ آہستہ نازل کی گئی حتی کہ وہ دلوں میں مستحکم اور مکمل ہو گئی۔ "نماز" معراج کے موقع پر ہجرت سے پہلے تین سال کے دوران فرض ہوئی اور کہا گیا ہے کہ ڈیڑھ سال کے دوران اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پانچ سال کے دوران ، کیونکہ اس کے متعلق علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اور اس کے باوجود اب بھی اپنی اصل حالت

میں فرض نہیں ہوئی۔

سب سے پہلے ظہر، عصر، عشاء اور صبح کی دو دو رکعتیں اور مغرب کی تین رکعتیں تھیں، کیونکہ یہ دن کے وتر ہوتے ہیں۔۔۔ ہجرت کے بعد اور مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سال گزارنے کے بعد حضر کی نماز بڑھا کر ظہر، عصر اور عشاء چار چار کر دی گئیں اور فجر کی نماز اپنی حالت پر رہی۔ (دو رکعت) کیونکہ اس میں قرأت لمبی ہوتی ہے اور مغرب کی بھی تین رکعت رہیں کیونکہ یہ دن کے وتر ہوتے ہیں اور زکوۃ ۲ہجری میں مقرر کی گئی یا مکہ میں فرض کی گئی، لیکن اس کے نصاب اور واجب ہونے کا فیصلہ ایک عرصہ تک نہ کیا گیا اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاملین کو زکوۃ لینے کے لئے بھیجا مگر ۹ھ میں۔ پس زکوۃ تین مراحل میں مرتب ہوئی۔

ا۔ مکہ میں "وَاٰتُوْحَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ" [الانعام:۱۴۱/۶] " اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔" سے نہ تو اس کا واجب ہونا بیان ہوا اور نہ وہ مقدار جس سے زکوۃ نکالنا واجب ہے اور یوں معاملہ کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا، اور ۲ھ میں زکوۃ کے نصاب کو بیان کر دیا گیا اور ۹ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عاملین کو مویشیوں اور پھلوں کے مالکوں کی طرف زکوۃ لینے کے لیے بھیجنے لگے۔ اللہ احکم الحاکمین نے شریعت کو نافذ کرنے میں لوگوں کے حالات کی کس قدر رعایت فرمائی ذرا غور کریں۔

اسی طرح روزے (جو کہ ہم پر مخفی نہیں) شریعت میں مرحلہ وار فرض ہوئے۔ سب سے پہلے انسان کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو روزے رکھ لے اور چاہے تو کسی کو کھانا کھلا دے۔ پھر روزے کو مقرر (فرض) کر دیا گیا اور کھانا کھلانا اس شخص کے لئے رہ گیا جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور یہ صورت آج تک قائم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حکمت اس بات کا انکار کرتی ہے کہ عالم دنیا کو عصر سے صبح تک بدل سکتا ہے۔ دعوت کے کام میں وقت صرف ہونا لازمی چیز ہے۔

اے داعی!۔۔۔ تو اپنے اس بھائی کی طرف متوجہ ہو جسے تو دعوت دے رہا ہے کہ اس کے پاس حق کتنا ہے؟ اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا رہ، یہاں تک کہ تو اس کو باطل سے

بالکل بیزار کر دے۔ تیرے پاس رہنے والے لوگ ایک جیسی استطاعت ذہانت والے نہیں ہیں، جاہل اور ضدی (سرکش) میں فرق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے چند نمونے:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت پیش کرنے کے کچھ نمونے بیان کروں:

پہلی مثال:

ایک بدو آدمی آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پس بدو مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کرنے لگا، لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین) اسے جھڑکنے لگے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کا وافر حصہ دے رکھا تھا) نے ان لوگوں کو اسے جھڑکنے اور برا بھلا کہنے سے منع کر دیا... جب اس نے پوری طرح پیشاب کر لیا تو آپ نے حکم دیا کہ اس کے بول (پیشاب) پر پانی کا ایک ڈول بہا دیا جائے۔ پلیدی ختم ہو گئی۔ پس اب آپ نے بدو کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا:

اِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا يَصْلَحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنَ الْاَذٰى اَوِالْقَذِرِ اِنَّمَا هِيَ لِلصَّلٰوةِ وَقِرَآءَةِ الْقُرْآنِ [مسلم: کتاب الطہارۃ]

میرے بھائی! "یہ مساجد ہیں اور ان مساجد میں گندگی اور پلیدی مناسب نہیں ہوتی۔ یہ تو صرف نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں"۔

اس حسن سلوک سے اعرابی (بدو) کا سینہ اسلام قبول کرنے کے لیے کھل گیا (اور وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا) میں نے بعض اہل علم کو یہ بات نقل کرتے دیکھا ہے کہ اس اعرابی نے کہا:

"اے اللہ! مجھ پر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ فرمانا۔"

کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اچھا سلوک کیا تھا جبکہ صحابہ

رضی اللہ عنہم اجمعین نے برائی (پلیدی) کو ختم کرنے کے لیے اپنی یہ کوشش کی تھی، تاہم وہ اس جاہل آدمی کے حال سے پوری طرح واقف نہ تھے۔

دوسری مثال:

سیدنا معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ لوگوں میں سے ایک آدمی کو چھینک آگئی۔ لہٰذا اس نے فوری طور پر "الحمد للہ" کہہ دیا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جب نماز میں تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو "الحمد للہ" کہنا چاہیے۔ چاہے قیام میں ہو یا رکوع میں یا سجدہ میں۔ اس فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اس آدمی نے جو "الحمد للہ" کہا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں "یرحمك اللہ" کہہ دیا (یہ حرکت آدمی کی نماز کے باطل ہونے کی علامت تھی) لوگوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی آنکھوں سے گھورا اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "ہائے! میری ماں مجھے گم پائے۔"

[مسلم: کتاب المساجد]

یہ کلمہ بے ساختہ کہا جاتا ہے اس کا معنی مراد نہیں لیا جاتا) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کلمہ کہا تھا جب سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو کہا تھا:

اَلاَ اُخْبِرُكَ بِمَلاَكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ

"کیا میں تجھے ان تمام اعمال کے اصل منبع کی خبر نہ دوں؟"

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا: "یا رسول اللہ! کیوں نہیں۔" آپ نے فرمایا:

قَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا اَخَذَ بِلِسَانِهٖ وَقَالَ كُفَّ عَلَيْكَ فَقَالَ مَعَاذٌ وَاَنَا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مَعَاذُ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلاَّ حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ۔

"اے معاذ! اپنی زبان کو روکے رکھ"۔ معاذ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "کیا ہم اپنی بات

چیت کی وجہ سے پوچھے جائیں گے؟" (یعنی قیامت کے روز ہم سے ہماری آپس کی باتوں کا بھی حساب لیا جائے گا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیری ماں تجھے گم پائے، لوگوں کو ان کی زبانوں کی کاٹ کی بنا پر آگ میں الٹا لٹکایا جائے گا۔"

[ترمذی: کتاب الایمان، ابن ماجہ: کتاب الفتن]

پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز کو جاری رکھا اور جب نماز پوری کی، انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! میں نے تعلیم دینے میں آپ سے بہتر کسی معلم کو نہیں دیکھا۔ (اے اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیج) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ترش روئی سے پیش آئے اور نہ ہی مجھے جھڑکا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا ارشاد فرمایا:

هٰذِهِ الصَّلٰوةُ لَا يَصْلَحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ اِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَآءَةُ الْقُرْآنِ، اَوْ كَمَا قَالَ

"بے شک نماز میں لوگوں کے کلام میں سے کوئی چیز مناسب نہیں ہوتی۔ اس میں صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔"

دلوں کو موہ لینے والی دعوت کے انداز پر غور فرمایئے، انسان اسے قبول بھی کرتا ہے اور اس سے سینہ بھی کھل جاتا ہے۔

تیسری مثال:

ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا: "یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا ہوں" آپ نے فرمایا: "تجھے کس نے ہلاک کر دیا؟" کہنے لگا: "میں نے رمضان میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے صحبت (جماع) کر لی ہے۔" یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک گردن (غلام) آزاد کرنے کا حکم دیا، اس پر اس نے کہا: "میں تو اس کی طاقت نہیں رکھتا" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا "مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔" وہ کہنے لگا: "میں یہ بھی نہیں کر سکتا (کہ میں کمزور وضعیف ہوں) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ: "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔" اس نے کہا: "میں یہ طاقت

بھی نہیں رکھتا۔(یعنی غریب اور مسکین آدمی ہوں اس لیے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کہاں سے کھلاؤں۔) اس کے بعد وہ آدمی بیٹھ گیا (تھوڑی دیر بعد کسی صحابی کی طرف سے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجوریں پیش کی گئیں۔آپ نے اس شخص سے فرمایا: "یہ لے اور لوگوں میں تقسیم کردے" لیکن اس آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت میں طمع کیا کیونکہ آپ تمام مخلوق سے زیادہ سخی تھے) آدمی کہنے لگا: "یارسول اللہ! کیا میں ان کھجوروں کو اپنے سے زیادہ محتاجوں میں تقسیم کروں؟ اللہ ذوالجلال کی قسم! ان دو وادیوں کے درمیان کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں ہے (یعنی غربت وفقیری کی بناپر دوسرے لوگوں کی نسبت میں ان کھجوروں کا زیادہ حق دار ہوں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانت مبارک ظاہر ہوگئے۔ کیونکہ یہ آدمی ڈرتے ہوئے آیا تھا اور کہا تھا "میں ہلاک ہوگیا" لیکن اب جارہا ہے تو کچھ حاصل کرکے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "(یہ کھجوریں تمام کی تمام تو ہی لے جا اور) اسے اپنے گھر والوں کو کھلادے"۔

[بخاری: کتاب الصوم]

لہٰذا اب وہ آدمی خوش وخرم کچھ لے کر جارہا تھا۔ اس دین اسلام کی برکت سے اور سب سے پہلے دعوت دینے والے (نبی کریم ﷺ) کی اس دین اسلام میں آسانیاں پیدا کرنے کی وجہ سے۔

چوتھی مثال:

اس بات کی طرف غور فرمایئے کہ آپ نے گناہ کرنے والے سے کیسا سلوک کیا۔ ایک آدمی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے مبارک ہاتھ سے اتار کر زمین پر پھینک دیا اور فرمایا:

يَعْمَدُ أَحَدُكُمْ إِلَى جَمْرَةٍ مِنْ نَارٍ فَيَضَعُهَا فِي يَدِهِ

"تم میں سے کوئی شخص آگ کے ایک انگارے پر بھروسہ کرکے اسے اپنے ہاتھ پر رکھ لیتا ہے"۔

اس واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دو آدمیوں جیسا معاملہ نہیں کیا بلکہ

اس کے ہاتھ سے اتار کر زمین پر پھینک دیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے تو اس کو کہا گیا اپنی انگوٹھی زمین سے اٹھالو تاکہ بعد میں کسی استعمال میں لا کر اس سے فائدہ اٹھالینا۔ اس نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! میں اس انگوٹھی کو نہیں پکڑ سکتا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینک دیا ہو۔" [مسلم: کتاب اللباس]

اللہ اکبر! صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی کس قدر عظیم تابعداری کی مثال ہے۔ داعی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہایت حکمت سے بلائے۔ "جاہل" عالم جیسا نہیں ہو سکتا اور "ضدی" ماننے والے جیسا نہیں ہو سکتا۔ ہر موقعہ کی نسبت سے بات کی جاتی ہے اور ہر مرتبے کی ایک حالت ہوتی ہے۔

چوتھی صفت "حسنِ اخلاق"

داعی کو عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونا چاہیے اور اس آدمی پر اس کے علم کا کچھ اثر ہونا چاہیے (عقائد میں عبادات میں اس کی شخصیت وہیئت میں اور اس کے تمام طریقوں میں) حتیٰ کہ اس کا دور مثالی ہو... اگر یہ باتیں برعکس ہوں گی تو اس کی دعوت فیل ہو جائے گی اگرچہ وقتی طور پر کامیابی معلوم ہی ہو کیونکہ اس کی کامیابی برائے نام (اور محض عارضی) ہوتی ہے۔ پس داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن باتوں کی دعوت دیتا ہو، ان سے خود آراستہ ہو (معاملات، عبادات، اخلاق اور تمام طریقوں میں) تاکہ اس کی دعوت مقبول ہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جن سے سب سے پہلے جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔

بھائیو! جب ہم اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ضرور محسوس کرتے ہیں کہ واقعی جن باتوں کی ہم دعوت دیتے ہیں، ہم خود ان پر عمل نہیں کرتے اور بلا شبہ یہ بہت بڑا نقص ہے (اے اللہ! ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس سے زیادہ صلاحیت والے بن سکیں) کیونکہ ہر مقام کے لحاظ سے بات کی جاتی ہے۔ کبھی برتر چیز کم درجہ کی ہو جاتی ہے اور کچھ عوامل کی بنا پر کم درجہ کی چیز اعلیٰ درجہ کی خیال کی جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض امور کی طرف دعوت دیتے تھے اور خود اس سے اہم امور میں مشغول ہو جاتے۔ کبھی اس قدر روزے رکھتے کہ کہا جاتا کہ اب کبھی افطار نہ کریں

گے اور کبھی اس قدر افطار کرتے کہ کہا جاتا، اب روزہ نہ رکھیں گے۔[بخاری: کتاب التہجد]

اے بھائیو! میں چاہتا ہوں کہ داعی ان تمام اخلاق سے آراستہ ہو جو داعی کے لئے از بس ضروری ہیں۔ یہاں تک کہ داعی صحیح معنوں میں داعی بن جائے تاکہ اس کی بات قبولیت کے عین قریب ہو جائے۔

پانچویں صفت "رکاوٹوں کو دور کرنے والا ہو"

داعی کو چاہیے کہ اپنے درمیان اور لوگوں کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹوں اور دیواروں کو توڑ ڈالے۔ کیونکہ ہمارے اکثر داعی حضرات جب لوگوں کو کسی برائی میں ملوث دیکھتے ہیں تو ان کی غیرت ایمانی اور اس برائی سے نفرت، ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ ان برے لوگوں کے پاس نہ تو جائیں اور نہ ہی ان کی خیر خواہی کریں۔ حالانکہ یہ طرز عمل غلطی پر مبنی ہے اور حکمت سے خالی ہے بلکہ حکمت و دانائی یہ ہے کہ آپ ان کے پاس جائیں، ان کو دعوت و تبلیغ کریں، اور انہیں نیک کام کرنے اور جنت کی ترغیب دیں اور برے کاموں اور دوزخ سے ڈرائیں۔ یہ کبھی بھی نہ کہیں کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔"

اے مسلمان داعی! جب تو ہی ان برے لوگوں کے ہاں نہ جائے گا اور نہ ہی انہیں اللہ کی طرف بلائے گا تو اور کون ان کا وارث ہو گا؟ کیا ان جیسا کوئی آدمی ان کا وارث ہو گا؟ کیا بے علم لوگ ان کی خبر لیں گے؟ کبھی نہیں۔

لہٰذا داعی کے لئے ضروری ہے کہ صبر کرے اور صبر کی کچھ مثالیں ہم نے پہلے ذکر کر دی ہیں یعنی اپنے دل پر کنٹرول کرے اور اس کو مجبور کرے اور لوگوں تک پہنچنے کے لیے درمیان کی تمام رکاوٹیں توڑ ڈالے تاکہ جن لوگوں کو ضرورت ہے ان تک اس کی دعوت پہنچ سکے۔۔۔ اگر وہ انکار کرے گا تو یہ بات اس طریقہ کے خلاف ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کے دنوں میں مشرکین کے پاس ان کے گھروں اور ٹھکانوں پر جاتے اور انہیں اللہ کی طرف بلاتے اور آپ سے ایک اثر منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلَا اَحَدٌ یَحْمِلُنِیْ حَتّٰی اُبَلِّغَ کَلَامَ رَبِّیْ فَاِنَّ قُرَیْشًا مَنَعَتْنِیْ اَنْ اُبَلِّغَ کَلَامَ رَبِّیْ۔

[سنن ابو داؤد: کتاب السنۃ]

"خبردار! ایک آدمی بھی مجھے اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ میں اپنے رب کے کلام کی تبلیغ کروں کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کے کلام کی تبلیغ سے روک دیا ہے"۔

پس جب یہ ہمارے نبی، پیشوا اور رہنما محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی تو ہمیں بھی چاہیے کہ ہم ان جیسے ہو جائیں۔

چھٹی صفت "مخالفین کے لئے انشراح صدر":

داعی کی یہ صفت بھی ہو کہ مخالفین کے لیے اس کا سینہ کھلا ہو۔ خصوصاً جبکہ وہ جان لے کہ اس کا مخالف حسن نیت سے اور صرف اپنی دلیل کو قائم کرنے کی غرض سے مخالفت کر رہا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ان تمام امور میں کامل ہو اور عداوت اور نفرت کو بھڑکانے کے لئے اس کی مخالفت نہ کرے۔۔۔ صرف اس شخص کے لیے جو حق کے ظاہر ہونے کے بعد سرکشی اور ضد کی بنا پر مخالفت کرے اور اپنے باطل عندیہ پر مصر بھی ہو، صرف اس شخص کے لئے نفرت آمیز معاملہ کرنا جائز ہے اور لوگوں کو اس سے بچانا چاہیے کیونکہ حق ظاہر ہونے کے بعد اس کی عداوت ظاہر ہوئی ہے، اس کو اختیار نہ کرے۔

جب لوگ مخالفت کریں تو پھر دعوت کا کام کیسے کریں؟

کچھ فروعی مسائل میں لوگ اختلاف کرتے ہیں اور حقیقت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے گنجائش رکھی ہے (یہ اصولی مسائل نہیں ہوتے جو کہ مخالف کو کافر بنا دیتے ہوں) اور اس میں غلطی ہو جانے کی بھی گنجائش ہے۔۔۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ فَاَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَاِنْ اَخْطَاَ فَلَہٗ اَجْرٌ وَاحِدٌ۔

[بخاری: کتاب الاعتصام]

"جب حاکم فیصلہ کرنے میں اجتہاد کرکے صحیح فیصلہ صادر فرمائے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اجتہاد میں غلطی کر بیٹھے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔"

جب آپ کی یہ خواہش ہو گی کہ کوئی آپ کی مخالفت نہ کرے تو آپ کے مخالف کی بھی

یہ آرزو ہوگی کہ دوسرے لوگ اس کی مخالفت نہ کریں۔۔۔ جس طرح آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ آپ کی بات کو قبول کریں، اسی طرح مخالفین بھی چاہئیں گے کہ لوگ ان کی بات کو قبول کریں۔ لہٰذا اختلاف کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس کے اصل مرجع کی طرف لوٹنا چاہیے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ۔ [شوریٰ: ۱۰/۴۲]

"اور (اے لوگو) تم جس بات میں اختلاف کر رہے ہو تو اس کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

[النساء: ۵۹/۴]

" پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔"

بحث اور اختلاف کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ ان دو بنیادی چیزوں کی طرف رجوع کریں یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی انسانی کلام کو اللہ اور اس کے رسول کے کلام کے سامنے لا کھڑا کرے، چاہے وہ کیسا (بلند مرتبے والا) ہی انسان ہو۔ پس جب آپ کے لیے حق ظاہر اور واضح ہو جائے تو آپ پر واجب اور ضروری ہے کہ مخالفت حق کی بات کو دیوار پر دے مارو۔ اور اس پر بالکل توجہ نہ دو، خواہ وہ دین اور علم کے لحاظ سے کتنے ہی اونچے مرتبے والا ہو کیونکہ انسان سے غلطی ہو سکتی ہے، لیکن اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں کوئی غلطی کا امکان نہیں۔ مجھے اس بات سے افسوس ہوتا ہے کہ لوگ حق کو طلب کرنے اور حق تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کر رہے ہیں اور ہر ایک کا ایک مخصوص و معین نام اور گروہ ہے اور ہر ایک کے جداگانہ اوصاف ہیں اور اُسی پر کاربند ہیں اور حقیقت میں یہ سب کچھ غلط ہے کیونکہ اللہ کا دین بھی ایک ہے اور امت اسلامیہ بھی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ۔ [المؤمنون: ۵۲/۲۳]

" اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس مجھ ہی سے تم ڈرو"۔

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔ [الانعام:۱۵۹/۶]

"اور اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں اور فرقہ فرقہ بن جائیں آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، پھر (قیامت کے دن) وہی انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کیا کرتے رہے تھے"۔

اور اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ۔ [شوریٰ:۱۳/۴۲]

"اس نے تمہارے دین کا واضح راستہ مقرر کیا (وہی راستہ) جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور (اے رسول) جس کی وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا (اور ہم نے ان کو بھی یہ حکم دیا تھا اور آپ کو بھی یہ حکم دے رہے ہیں) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں متفرق نہ ہونا"۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ہمارے لیے توجیہ بیان فرمادی ہے لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس توجیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اصلاح (تحقیق) کی نیت سے (شرعی مسائل میں) ایک دوسرے سے اختلاف اور بحث و تکرار کریں۔ ہماری نیت تنقید کرنا اور انتقام لینا نہ ہو۔ کیونکہ جو انسان بھی اپنی رائے کو ترجیح دینے اور دوسرے کی رائے کو حقیر سمجھنے یا تنقید کی نیت سے دوسروں سے جھگڑا اور مجادلہ کرتا ہے، یقیناً اس نے ایسی روش اختیار کی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں کرتے۔

لہٰذا اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہم پر واجب ہے کہ ہم ایک جماعت بن جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہر ایک سے غلطی بھی ممکن ہو سکتی اور وہ

شخص درست انداز میں کام بھی کرتا ہے۔ اگرچہ اصلاحی کام میں اعتراض اور تنقید کرنا غلط بات ہے لیکن غلطی کی اصلاح کے لیے ایسا راستہ اختیار کرنا کہ اس شخص کی غیر موجودگی میں بات کی جائے، یا دل میں کینہ رکھا جائے، یہ غلط ہے۔ اصلاح کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بیٹھا جائے اور (قرآن وحدیث کی روشنی میں) بحث وغیرہ کی جائے۔ پس جب ظاہر ہو جائے کہ آدمی اپنی سرکشی پر ضد کر رہا ہے اور وہ باطل پر اڑا ہوا ہے پس اس وقت عذر کی گنجائش ہے اور ہے بھی حق۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی غلطی کو ظاہر کیا جائے اور لوگوں کو اس کی غلطی سے ڈرایا جائے تاکہ تمام امور سدھر جائیں، لیکن فرقہ بندی اور گروہ بندی ایسا امر (ناسور) ہے کہ اس کو کوئی آنکھ بھی پسند نہیں کرتی مگر وہ شخص جو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہو۔

میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر جمع کر دے اور ہمیں ان لوگوں سے کر دے کہ (جو اختلاف کے وقت یا کسی مسئلہ میں رہنمائی حاصل کرنے کے وقت) اللہ اور اس کے رسول کی طرف فیصلہ لے کر جاتے ہیں۔ اللہ رب العزت ہماری نیت خالص کر دے اور اس کی شریعت میں سے جو کچھ ہم پر پوشیدہ ہے اس کو ظاہر کر دے، بے شک وہ سخی اور عزت والا ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

باب:۴

داعیانہ کردار کے آداب

۱: اپنے منصب کا حقیقی شعور پیدا کیجیے، آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں اور دعوت دین، شہادت حق اور تبلیغ کا وہی فریضہ آپ کو انجام دینا ہے جو خدا کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیتے رہے، لہٰذا وہی داعیانہ تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اور امتیازی وصف ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

هُوَاجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ [الحج:۷۸]

" اس نے تمہیں منتخب فرمالیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے، پیروی کرو اس دین کی جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے۔ اس نے پہلے ہی سے تمہیں مسلم کے نام سے نوازا تھا اور اس سلسلے میں بھی تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے دینِ حق کی شہادت دیں اور تم سارے انسانوں کے سامنے دین حق کی شہادت دو"۔

یعنی امت مسلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشین ہے اور اس کو وہی کام انجام دینا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔ جس طرح آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل اور شب و روز کی تگ و دو سے خدا کے دین کو واضح کرنے کا حق ادا کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح امت کو بھی دنیا کے سارے ہی انسانوں کے سامنے خدا کے دین کو واضح کرنا ہے اور اسی احساسِ فرض اور داعیانہ تڑپ کے ساتھ دینِ حق کی زندہ شہادت بن کر زندہ رہنا ہے۔

۲: اپنی اصل حیثیت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھیے اور اس کے شایانِ شان اپنی زندگی کو بنانے

اور بنائے رکھنے کی کوششِ پیہم جاری رکھیے۔ آپ دنیا کی دیگر امتوں کی طرح ایک عام امت نہیں ہیں، بلکہ خدا نے آپ کو امتیازی شان بخشی ہے۔ آپ کو دنیا کی تمام قوتوں میں صدر کی طرح رہنمائی کا مقام حاصل ہے۔ آپ ہر افراط و تفریط سے پاک، خدا کی سیدھی شاہراہ پر اعتدال کے ساتھ قائم ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

[البقرہ:]

" اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں کے لیے دینِ حق کے گواہ بنو، اور ہمارے رسول اللہ ﷺ تمہارے لیے گواہ ہوں۔"

۳: اپنے نصب العین کا واقعی علم حاصل کیجیے اور شرح صدر کے ساتھ اس کو اپنانے کی کوشش کیجیے۔ خدا کی نظر میں امت مسلمہ کا نصب العین قطعی طور پر یہ ہے کہ وہ کامل یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ اس پورے دین کو قائم اور نافذ کرے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جو عقائد وعبادات، اخلاق ومعاشرت اور معیشت وسیاست غرض انسانی زندگی سے متعلق تمام آسمانی ہدایات پر مشتمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد واخلاق کی تعلیم بھی دی، عبادات کے طریقے بھی سکھائے، دین کی بنیادوں پر سماج کی تعمیر بھی فرمائی اور انسانی زندگی کو منظم کرنے اور خیر وبرکت سے مالا مال کرنے والی ایک بابرکت اسٹیٹ بھی قائم کی۔ خدا کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ [الشوری: ۱۳]

" مسلمانو! خدا نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوح علیہ السلام کو کی تھی اور جس کی وحی اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراھیم اور موسی اور عیسی علیہم السلام کو دے چکے ہیں کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔"

۴: برائیوں کو مٹانے اور بھلائیوں کو قائم کرنے کے لیے ہمہ وقت کمربستہ رہیے۔ یہی آپ کے ایمان کا تقاضا ہے اور یہی آپ کے ملی وجود کا مقصد ہے۔ اسی مقصد کے لیے زندہ رہیے اور اسی کے لئے جان دیجیے۔ اسی کام کو انجام دینے کے لئے خدا نے آپ کو "خیر امت" کے عظیم لقب سے سرفراز کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ۔

[آل عمران: ۱۱۰]

" تم خیر امت (بہترین امت) ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور خدا پر کامل ایمان رکھتے ہو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم لوگ لازماً نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو، ورنہ عنقریب خدا تم پر ایسا عذاب بھیج دے گا کہ پھر تم پکارتے رہو گے اور کوئی شنوائی نہ ہو گی۔" [ترمذی]

۵: خدا کا پیغام پہنچانے اور بندگانِ خدا کو جہنم کے ہولناک عذاب سے بچانے کے لئے داعیانہ تڑپ اور مثالی درد وسوز پیدا کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال تڑپ اور بے پایاں درد کا اعتراف قرآن نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ [الکہف:۶]

" شاید آپ ان لوگوں کے پیچھے اپنی جان ہلاک ہی کر ڈالیں گے اگر یہ لوگ اس کلامِ ہدایت پر ایمان نہ لائیں۔"

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

" میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑے پتنگوں کو روک رہا ہے، لیکن پتنگے ہیں کہ اس کوشش کو ناکام بنائے دیتے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں (اسی طرح) میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو"۔ [مشکوٰۃ]

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اُحد سے زیادہ سخت دن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی گزرا ہے۔ فرمایا: ہاں عائشہ ! میری زندگی میں سب سے زیادہ سخت دن عقبہ کا دن تھا۔ "یہ وہ دن تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے والوں سے مایوس ہو کر طائف والوں کو خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں کے سردار عبد یالیل نے غنڈوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا اور انہوں نے پیغام رحمت کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لہولہان ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی پریشان اور غمگین وہاں سے چلے۔ جب قرن الثعالب پہنچے تو غم کچھ ہلکا ہوا۔ خدا نے عذاب کے فرشتے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ عذاب کے فرشتے نے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تو میں ابو قبیس اور جبل احمر کو آپس میں ٹکرا دوں اور ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں یہ بدبخت پس کر اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں نہیں ! مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنی قوم کو خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں، شاید کہ خدا انہی کے دلوں کو ہدایت کے لئے کھول دے یا پھر ان کی اولاد میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہدایت کو قبول کر لیں"۔ [بخاری و مسلم]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں ہیں اور مکے کے لوگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے انہیں شہر سے نکال دو۔ کوئی کہتا ہے انہیں قتل کر دو۔ انہی دنوں مکے کو اچانک قحط نے آگھیرا۔ ایسا قحط کہ قریش کے لوگ پتے اور چھال کھانے پر مجبور ہو گئے۔ بچے بھوک سے بلبلاتے اور بڑے ان کی حالت زار دیکھ کر تڑپ تڑپ اٹھتے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو اس لرزہ خیز مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ساتھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان جانی دشمنوں کو جن کے پہنچائے زخم ابھی بالکل تازہ تھے، اپنی دلی ہمدردی کا پیغام بھیجا اور ابو سفیان اور صفوان کے پاس پانچ سو دینار بھیج کر کہلوایا کہ یہ دینار ان قحط کے مارے ہوئے غریبوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ حقیقت

یہ ہے کہ گمراہ بندوں کے غم میں گھلنا، ان کی گمراہی اور مصیبت پر کڑھنا، ان کو خدا کے غضب سے بچانے کے لئے تڑپنا، ان کی تکلیف دیکھ کر بے قرار ہونا اور ان کی ہدایت کے لیے غیر معمولی حریص ہونا یہی ایک داعی حق کے وہ جوہر ہیں جن کے ذریعے اس کی زندگی انتہائی دل کش اور غیر معمولی اثر انگیز بن جاتی ہے۔

۶: قوم کی بے لوث خدمت کیجیے اور اپنی کسی خدمت کا صلہ بندوں سے طلب نہ کیجیے۔ جو کچھ کیجیے محض خدا کی خوشنودی کیلئے کیجیے اور اسی سے اپنے اجر وثواب کی توقع رکھیے۔ خدا کی رضا اور خدا ہی سے اجر وثواب کی طلب ایسا محرک ہے جو آدمی کی بات میں اثر پیدا کرتا ہے اور آدمی کو مسلسل سرگرم رکھتا ہے۔ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اسے نیند آتی ہے، نہ اونگھ۔ اس کی نظر سے بندے کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنے مخلصین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا وہ محنت سے کہیں زیادہ دیتا ہے اور کسی کو محروم نہیں کرتا۔ پیغمبر بار بار اپنی قوم سے کہتے تھے:

"میں تم سے کسی اجر اور بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔"

۷: اسلام کی گہری بصیرت حاصل کیجیے اور یقین رکھیے کہ خدا کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے، اس دین حق کو چھوڑ کر جو طریق زندگی بھی اختیار کیا جائے گا۔ خدا کے یہاں اس کی کوئی قدر وقیمت نہ ہوگی۔ خدا کے یہاں تو وہی دین مقبول ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی عملی تفسیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مبارک زندگی سے پیش فرمائی۔ قرآن پاک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے لوگوں کو صاف صاف بتا دیجیے کہ میں نے جو راہ بھی اپنائی ہے، سوچ سمجھ کر پوری بصیرت کے ساتھ اپنائی ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ [یوسف:۱۰۸]

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ میرا راستہ تو

یہ ہے، میں اور میرے پیچھے چلنے والے پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور خدا ہر عیب سے پاک ہے اور میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں جو خدا کے ساتھ شرک کر رہے ہیں"۔

اور خدا کا صاف صاف ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

[آل عمران: ۸۵]

" اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو اختیار کرنا چاہے گا اس کا وہ دین ہر گز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد ہو گا"۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

"اور خدا کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے"۔

۸: اپنے نصب العین کی عظمت اور اہمیت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھیے اور خیال رکھیے کہ یہ وہ عظیم کام ہے جس کے لیے خدا کی طرف سے ہمیشہ انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور یہ یقین رکھیے کہ خدا نے آپ کو دین کی جو دولت عطا فرمائی ہے یہی دونوں جہان کی عظمت و سربلندی کا سرمایہ ہے، بھلا اس کے مقابلہ میں دنیا کی دولت اور شان و شوکت کی کیا قدر و قیمت ہے جو چند روزہ بہار ہے۔ قرآن میں ہے:

" اور ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیتیں اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے تو آپ اس فانی متاع کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جو ہم نے ان کے مختلف طبقوں کو دے رکھا ہے۔"

اور اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ [المائدہ: ۶۸]

" اے اہل کتاب! تم کچھ نہیں ہو، جب تک تم تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب نے نازل فرمائی ہیں۔"

۹: دین کا صحیح فہم حاصل کرنے اور دین کی حکمتوں کو سمجھنے کی برابر کوشش کرتے

رہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"خدا جس شخص کو خیر سے نوازنا چاہتا ہے اسے اپنے دین کا صحیح فہم اور گہری سوجھ بوجھ عطا فرماتا ہے"۔ [بخاری و مسلم]

حقیقت یہ ہے کہ دین کا صحیح فہم اور دین کی حکمت ہی تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص اس خیر سے محروم ہے وہ دونوں جہان کی سعادتوں سے محروم ہے۔ نہ اس کی زندگی میں توازن اور یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ زندگی کے ہر میدان میں دین کی صحیح نمائندگی کر سکتا ہے۔

۱۰: جو کچھ دنیا کے سامنے پیش کریں اس کا مطلب سب سے پہلے اپنی ذات کو بنایئے۔ دوسروں کو بتانے سے پہلے خود کو بتایئے اور جو دوسروں سے چاہیں پہلے خود کرکے دکھایئے۔ دین حق کے داعی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا سچا نمونہ ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے، اپنے عمل و کردار کو اس پر گواہ بناتا ہے، جن حقیقتوں کو قبول کرنے میں وہ دنیا کی بھلائی دیکھتا ہے خود اس کا سب سے زیادہ حریص ہوتا ہے۔ پیغمبر جب قوم کے سامنے دعوت دینے اٹھے تو انہوں نے اعلان کیا "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" میں خود سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

آپ زبان و قلم سے بھی گواہی دیجیے کہ حق وہی ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں اور اپنے انفرادی عمل، خانگی تعلقات، سماجی معاملات اور سیاسی اور ملکی سرگرمیوں سے بھی یہ ثابت کیجیے کہ دین حق کو اپنا کر ہی پاکیزہ کردار وجود میں آتا ہے، مستحکم خاندان بنتا ہے، اچھا سماج تشکیل پاتا ہے اور ایک ایسا نظام تہذیب و تمدن بنتا ہے جس کی بنیاد عدل وانصاف پر ہو، جو لوگ اپنی تربیت واصلاح سے غافل ہو کر دوسروں کی اصلاح وتربیت کی باتیں کرتے ہیں وہ انتہائی نادان ہیں۔ وہ اپنا گھر جلتا ہوا دیکھ کر بے فکر ہیں اور پانی کی بالٹیاں لیے تلاش کر رہے ہیں کہ کسی کے گھر کو آگ لگی مل جائے تو اس کو بجھا دیں۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی ناکام ہیں اور آخرت میں بھی ناکام رہیں گے۔ یہاں تو ان کی بے عملی ان کی پند و نصیحت کو بے وزن اور بے اثر کرتی رہے گی اور آخرت میں یہ انتہائی عبرت ناک عذاب بھگتیں گے۔ خدا کو یہ بات انتہائی ناگوار ہے کہ

دوسروں کو نصیحت کرنے والے خود بے عمل رہیں اور وہ کہیں جو خود نہ کرتے ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بے عمل داعیوں کو انتہائی ہولناک عذاب سے ڈرایا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" قیامت کے روز ایک آدمی لایا جائے گا اور آگ میں پھینک دیا جائے گا، اس کی انتڑیاں اس آگ میں باہر نکل پڑیں گی اور پھر وہ آدمی ان انتڑیوں کو اس طرح لیے پھر رہا ہو گا جس طرح گدھا اپنی چکی میں پھرتا ہے۔ یہ دیکھ کر دوسرے جہنمی لوگ اس کے پاس جمع ہوں گے اور پوچھیں گے اے فلاں! یہ تمہارا کیا حال ہے؟ کیا تم دنیا میں ہمیں نیکیوں کی تلقین نہیں کرتے تھے؟ اور برائیوں سے نہیں روکتے تھے؟ (ایسے نیکی کے کام کرنے کے باوجود تم یہاں کیسے آگئے؟) وہ آدمی کہے گا، میں تمہیں تو نیکیوں کا سبق دیتا تھا لیکن خود نیکی کے قریب بھی نہیں جاتا تھا، تمہیں تو برائیوں سے روکتا تھا لیکن خود برائیوں پر عمل کرتا تھا"۔ [مسلم وبخاری]

معراج کی شب جو عبرت انگیز مناظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے رکھے گئے ہیں ان کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ کوتاہ کار لوگوں کو تنبیہ ہو اور وہ اپنی اصلاح حال کی فکر کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے معراج کی شب میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: " یہ آپ کی امت کے مقررین ہیں۔ یہ لوگوں کو نیکی اور تقویٰ کی تلقین کرتے تھے اور خود کو بھولے ہوئے تھے"۔ [مشکوٰۃ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اس قسم کے کوتاہ کاروں اور بے عملوں کو سخت تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کہا، حضرت میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دوں اور برائیوں سے روکوں اور دعوت و تبلیغ کا کام کروں! حضرت نے فرمایا کیا تم اس مرتبے پر پہنچ چکے ہو کہ مبلغ بنو۔ اس نے کہا، ہاں توقع تو ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر تمہیں یہ اندیشہ نہ ہو کہ قرآن پاک کی تین آیتیں تمہیں رسوا کر دیں گی تو شوق سے تبلیغ دین کا کام کرو۔ وہ شخص بولا: حضرت وہ کون

سی تین آیتیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلی آیت یہ ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ [البقرہ: ۴۴]

"کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو"۔

دوسری آیت: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ [الصّف: ۲]

"تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو"۔

تیسری آیت:

مَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهٰكُمْ عَنْهُ۔ [ہود: ۸۸]

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا) جن بری باتوں سے میں تمہیں منع کرتا ہوں ان کو بڑھ کر خود کرنے لگوں میری یہ خواہش نہیں ہے۔ (بلکہ میں تو ان باتوں سے بہت دور رہوں گا۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا: بتاؤ! تم نے اس آیت پر بخوبی عمل کر لیا ہے وہ شخص بولا نہیں۔ تو حضرت نے فرمایا: جاؤ پہلے اپنے آپ کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

۱۱: نماز کو اس کے پورے آداب وشرائط اور شغف کے ساتھ ادا کیجیے۔ نوافل کا بھی اہتمام کیجیے۔ خدا سے گہرا تعلق قائم کیے بغیر اس کی دعوت و تبلیغ کا کام ممکن نہیں۔ اور خدا سے وابستگی پیدا کرنے کا یقینی ذریعہ نماز ہے جو خود خدا ہی نے اپنے بندوں کو بتایا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے خدا نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۔ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۔ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا۔ [المزمل: ۱ تا ۵]

"اے چادر لپیٹنے والے! رات میں قیام کیجیے۔ مگر کچھ رات، آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔ ہم جلد آپ پر ایک بھاری فرمان (کی ذمہ داری) ڈالنے والے ہیں۔"

بھاری فرمان کی ذمہ داری سے مراد دینِ حق کی تبلیغ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ذمہ

داری دنیا کی تمام ذمہ داریوں میں زیادہ بھاری اور گراں ہے اس عظیم ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ نماز سے قوت حاصل کریں اور خدا سے تعلق مضبوط کریں۔

۱۲: قرآن سے شغف پیدا کیجیے اور پابندی کے ساتھ اس کی تلاوت کیجیے۔ نماز میں بھی انتہائی توجہ کے ساتھ تلاوت کیجیے اور نماز کے باہر بھی ذوق وشوق کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔ دل کی آمادگی اور طبیعت کی حاضری کے ساتھ جو تلاوت کی جاتی ہے اس سے قرآن کو سمجھنے اور غور وفکر کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اور ذوق وشوق میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک ہدایت وعبرت کا واحد سرچشمہ ہے۔ یہ اسی لیے نازل ہوا ہے کہ اس کی آیات پر غور کیا جائے اور اس کی تذکیر ونصیحت سے فائدہ اٹھایا جائے، لہٰذا اس میں غور وتدبر کی عادت ڈالیے اور اس عزم کے ساتھ اس کی تلاوت کیجیے کہ اسی کی رہنمائی میں اپنی زندگی بھی تعمیر کرنی ہے اور اسی کی ہدایت کے مطابق سماج کو بھی بدلنا ہے۔ خدا کے دین کو وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جو اپنے غور وفکر کا مرکز اور اپنی دلچسپیوں کا محور قرآن پاک کو بنائیں۔ اس سے بے نیاز ہو کر نہ تو خود دین پر قائم رہنا ممکن ہے اور نہ اقامت دین کی کوشش میں حصہ لینے ہی کا کوئی امکان ہے۔ تلاوت کرنے والوں کو ہدایت کی گئی ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ [ص:۲۹]

"کتاب جو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجی ہے سرتاپا برکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور وتدبر کریں اور عقل سلیم رکھنے والے اس سے سبق حاصل کریں"۔

اور ہدایت کی گئی:

"اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے"۔ [المزمل:۴]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"یہ قلوب زنگ آلود ہو جاتے ہیں، جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب اس پر پانی پڑتا ہے، پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی چیز کیا ہے؟ فرمایا: "دل کا زنگ اس طرح دور ہوتا ہے کہ آدمی موت کو کثرت سے یاد کرے اور

دوسرے یہ کہ قرآن کی تلاوت کرے"۔[مشکوٰۃ]

۱۳: ہر حال میں خدا کا شکر ادا کیجیے اور جذبۂ شکر پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں پر نگاہ رکھیے جو دنیاوی شان و شوکت اور مال و دولت میں آپ سے کمتر ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

" ان لوگوں کی طرف دیکھو جو تم سے مال و دولت اور دنیاوی جاہ و مرتبے میں کم ہیں (تو تمہارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا) اور ان لوگوں کی طرف نہ دیکھو جو تم سے مال و دولت میں اور دنیاوی ساز و سامان میں بڑھے ہوئے ہیں تاکہ جو نعمتیں تمہیں اس وقت ملی ہوئی ہیں وہ تمہاری نگاہ میں حقیر نہ ہوں، (ورنہ خدا کی ناشکری کا جذبہ پیدا ہوگا)۔

۱۴: عیش کوشی سے بچیں اور حق کے ایسے سپاہی بنیے جو ہر وقت ڈیوٹی پر ہو اور کسی وقت بھی ہتھیار نہ اتاریئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

" میں عیش و سہولت کی زندگی کیسے گزاروں! جب کہ اسرافیل صور منہ میں لیے کان لگائے، سر جھکائے انتظار کر رہے ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہوتا ہے۔"

اور قرآن پاک میں مؤمنوں کو خطاب کرتے ہوئے خدا نے ارشاد فرمایا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّاسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ [الانفال:۶۰]

" اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے خدا کے دشمنوں اور خود اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداءِ دین کو خوف زدہ کر دو۔ جنہیں تم نہیں جانتے خدا جانتا ہے۔ خدا کی راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کروگے۔ اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارا حق دینے میں ذرا کمی نہ کی جائے گی"۔

۱۵: دین کی خاطر ہر قربانی دینے اور ضرورت پڑنے پر اپنے وطن عزیز سے ہجرت کرنے

کے لیے بھی خود کو آمادہ رکھیے اور خود کو برابر تولتے رہیے کہ کس حد تک آپ کے اندر یہ جذبہ قوت پکڑ رہا ہے۔

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعۂ ہجرت بیان کرتے ہوئے ہجرت کی ترغیب اور قربانیوں کے لیے تیار رہنے کی تلقین اس طرح کی گئی ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا۔ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ط اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا۔ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ج لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ط اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ صلے عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا۔ [مریم: ۴۱ تا ۴۸]

" اور اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کے قصے سے نصیحت حاصل کیجیے۔ بلا شبہ وہ ایک سچے نبی تھے (لوگوں کو اس وقت کا ذکر سنایئے) جب انہوں نے اپنے والد سے کہا۔ ابا جان! آپ ان چیزوں کی عبادت کیوں کر رہے ہیں؟ جن کو نہ سنائی دیتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے اور نہ آپ کے کسی کام آسکتے ہیں، ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے، آپ میرے کہے پر چلیں، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلاؤں گا، ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے، شیطان تو رحمٰن کا بڑا نافرمان ہے، ابا جان! مجھے ڈر ہے کہ (آپ اسی روش پر اگر رہے تو) رحمان کا عذاب آپ کو آپکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں"۔

باپ نے کہا ابراھیم علیہ السلام! کیا تم میرے معبودوں سے پھر گئے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا، اور جاؤ ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا آپ کو میرا اسلام ہے۔ میں اپنے پروردگار سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کی بخشش فرمادے۔ بے شک میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں سے بھی کنارا کرتا ہوں اور ان ہستیوں سے بھی جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو، میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر ہر گز نامراد نہ رہوں گا۔"

۱۶: خدا کی راہ میں نکلنے کی تڑپ، جان ومال سے جہاد کرنے کا جذبہ اور اس کی راہ میں شہادت پانے کی پاکیزہ آرزو پیدا کیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاد ایمان کا معیار ہے اور جس دل میں اس کی آرزو نہ ہو وہ ایمان وہدایت سے محروم ایک بے رونق اور ویران کھنڈر ہے۔ میدانِ جہاد میں پہنچنے کی توفیق اور خدا کی راہ میں جان ومال قربان کر دینے کا موقع پانا واقعی بہت بڑی سعادت ہے، لیکن اگر ایسے حالات نہ ہوں کہ آپ اس کا موقع پا سکیں یا وسائل وذرائع نہ ہوں کہ آپ میدانِ جہاد میں پہنچ کر ایمان کے جوہر دکھا سکیں تب بھی آپ کا شمار خدا کے یہاں ان مجاہدوں میں ہو سکتا ہے، جو راہِ خدا میں شہید ہوئے یا غازی بن کر لوٹے بشرطیکہ آپ کے دل میں راہِ خدا میں نکلنے کی تڑپ ہو، دین کی راہ میں قربان ہونے کا جذبہ ہو، اور شہادت کی آرزو ہو۔ اس لیے کہ خدا کی نظر ان قلبی جذبات پر ہوتی ہے جو مجاہدانہ کارناموں کے لیے آدمی کو بے چین کرتے ہیں۔ غزوۂ تبوک سے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو رہے تھے تو راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا:

" مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے جو کوچ بھی کیا اور جو وادی بھی طے کی وہ برابر تمہارے ساتھ رہے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے تعجب سے پوچھا: "کیا مدینے میں رہتے ہوئے؟ فرمایا: " ہاں مدینے میں رہتے ہوئے، کیونکہ ان کو مجبوری نے روک لیا تھا وہ خود رکنے والے نہ تھے"۔

قرآن پاک میں بھی خدا نے ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو جذبہ رکھنے کے باوجود شرکتِ جہاد سے محروم رہے اور اپنی اس محرومی پر ان کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں:

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔ [التوبہ: ۹۲]

" اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر الزام ہے جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ آپ ان کے لیے سواریاں مہیا فرمادیں اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی

آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس غم میں کہ ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لیے خرچ کرنے کو کچھ موجود نہیں ہے"۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کیے بغیر مر گیا۔ اور اس کے دل میں اس کی آرزو بھی نہیں تھی تو وہ نفاق کی ایک کیفیت میں مرا"۔ [مسلم]

حقیقت یہی ہے کہ خدا کی راہ میں لڑنے اور جان ومال کی قربانی پیش کرنے کے جذبے سے جو سینہ خالی ہے وہ مؤمن کا سینہ نہیں ہو سکتا۔

دعوت و تبلیغ کے آداب:

۱: دعوت و تبلیغ میں حکمت اور سلیقے کا پورا پورا خیال رکھیے اور ایسا طریقہ کار اختیار کیجیے جو ہر لحاظ سے انتہائی موزوں، پر وقار، مقصد سے ہم آہنگ اور مخاطب میں شوق اور ولولہ پیدا کرنے والا ہو۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ [النحل]

" اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیجیے حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کیجیے تو ایسے طریقے پر جو انتہائی بھلا ہو۔"

قرآن کی اس جامع آیت سے تین اصولی ہدایات ملتی ہیں:

۱: دعوت حکمت کے ساتھ دی جائے۔

۲: نصیحت اور فہمائش عمدہ انداز سے کی جائے۔

۳: مباحثہ بھلے طریقے پر کیا جائے۔

حکمت کے ساتھ دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ خود آپ کو اپنی دعوت کے تقدس اور عظمت کا پورا پورا احساس ہو، اور آپ اس گراں بہا دولت کو نادانی کے ساتھ یوں ہی جا بے جا نہ بکھیریں بلکہ آپ موقع محل کا بھی پورا لحاظ رکھیے اور مخاطب کا بھی، ہر طبقے، ہر گروہ اور ہر فرد سے اس کی فکری رسائی، استعداد، صلاحیت، ذہنی کیفیت اور سماجی حیثیت کے مطابق کیجیے اور ان اٹل قدروں کو باہمی افہام و تفہیم اور دعوت کی بنیاد بنائیے جن میں باہم اتفاق ہو اور جو

قربت و قبولیت کے لیے راہ ہموار کریں۔

عمدہ نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس سوز، خیر خواہی اور خلوص کے ساتھ نیک جذبات کو ابھاریئے کہ مخاطب شوق و رغبت کے جذبات سے سرشار ہو جائے اور دین سے اس کا تعلق محض ذہنی اطمینان کی حد تک نہ رہے بلکہ دین اس کے دل کی آواز، روح کی غذا اور جذبات کی تسکین بن جائے۔

تنقید و مباحثے میں اچھا طریقہ اختیار کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی تنقید تعمیری ہو، دلسوزی اور اخلاص کی آئینہ دار ہو اور انداز ایسا دل نشین اور سادہ ہو کہ مخاطب میں ضد، نفرت، ہٹ دھرمی، تعصب اور حمیتِ جاہلیت کے جذبات نہ ابھریں بلکہ وہ واقعی کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو، اور اس میں حق کی طلب پیدا ہو اور جہاں یہ کیفیتیں پیدا ہوتی نظر نہ آئیں آپ اپنی زبان بند کر لیجیے اور اس مجلس سے اٹھ کر چلے آیئے۔

۲: ہر حال میں پورے دین کی دعوت دیجیے اور اپنی سمجھ سے اس میں کانٹ چھانٹ نہ کیجیے۔ اسلام کی دعوت دینے والے کو یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس کے کچھ اجزاء پیش کریں اور کچھ چھپائے رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

[یونس: ۱۵ تا ۱۷]

"اور جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں، اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لایئے یا اسی میں کچھ تغیر و تبدل کر دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے کہ میں اپنی طرف سے ہرگز اس میں کچھ کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود اسی وحی کا پیرو ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا خوف ہے اور کہیے اگر

خدا نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں نہ سنا سکتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کرے یا خدا کی (واقعی) آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقینا مجرم لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں داعی کا کام بہر حال یہی ہے کہ دین کو اپنی اصل اور مکمل حالت میں پیش کرے، خدا کے دین میں کمی بیشی اور حالات کے تقاضوں کے تحت اپنی سمجھ سے اس میں تغیر و تبدل بہت بڑا ظلم ہے اور ایسے لوگوں کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ اسلام اس خدا کا بھیجا ہوا دین ہے جس کا علم پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو ازل سے ابد تک کا یقینی علم رکھتا ہے اور جس کا نقطۂ نظر غلطی سے قطعاً پاک ہے، جو انسانی زندگی کے آغاز سے بھی واقف ہے اور انجام سے بھی اور جس کی مشیت کے تحت ہی انسانی معلومات میں روز بروز حیرت انگیز وسعت پیدا ہو رہی ہے اور انسانی زندگی میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوتی جارہی ہیں، کسی اور کے لیے تو بھلا کسی کمی بیشی کی کیا گنجائش ہو گی جب کہ خود داعیٔ اول کا مقام یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ایک مثالی فرمانبردار کی طرح اس دین کی پیروی کریں اور نافرمانی کے تصور سے لرزتے رہیں۔

۳: دین کو اس حکمت کے ساتھ فطری انداز میں پیش کیجیے کہ وہ غیر فطری بوجھ نہ محسوس ہو اور لوگ بدکنے اور متنفر ہونے کے بجائے، اس کو قبول کرنے میں سکون اور راحت محسوس کریں، اور آپ کی نرمی، شیریں زبانی اور حکیمانہ طرزِ دعوت سے لوگ دین میں غیر معمولی کشش محسوس کریں، حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ایک بار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی کو چھینک آئی، میں نے نماز ہی میں "یرحمك الله" کہہ کر چھینک کا جواب دے دیا۔ لوگ مجھے گھورنے لگے۔ میں نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ تو لوگوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ جب نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے۔ میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان، میں نے ایسا بہترین تعلیم وتربیت کرنے والا نہ ان سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ ان کے بعد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو مجھے ڈانٹا۔ نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا۔ صرف یہ فرمایا:

"دیکھو! یہ نماز ہے۔ نماز میں بات چیت کرنا مناسب نہیں۔ نماز تو نام ہے خدا کی پاکی اور برتری بیان کرنے کا۔ اس کی بڑائی بیان کرنے اور قرآن پڑھنے کا"۔

۴: اپنی تحریر، تقریر اور دعوتی گفتگوؤں میں ہمیشہ اس اعتدال کا اہتمام رکھیے کہ سننے والوں پر امید کی کیفیت بھی طاری رہے اور خوف کی بھی۔ نہ تو خوف پر ایسا مبالغہ آمیز زور دیجیے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے لگیں اور اپنی اصلاح اور نجات انہیں نہ صرف مشکل بلکہ محال نظر آنے لگے اور نہ خدا کی رحمت اور بخشش کا ایسا تصور پیش کیجیے کہ وہ بالکل ہی بے باک اور غیر ذمہ دار بن جائیں اور خدا کی بے پایاں رحمت وبخشش کا سہارا لے کر نافرمانیوں پر کمر باندھ لیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" بہترین عالم وہ ہے جو لوگوں کو (ایسے انداز سے خدا کی طرف دعوت دیتا ہے کہ) خدا سے مایوس نہیں کرتا اور نہ خدا کی نافرمانی کے لئے انہیں رخصتیں دیتا ہے اور نہ خدا کے عذاب سے انہیں بے خوف بناتا ہے۔"

۵: دعوتی کوششوں میں دوام اور تسلسل پیدا کیجیے اور جو پروگرام بنائیں اسے استقلال اور ذمہ داری کے ساتھ برابر چلاتے رہنے کی کوشش کیجیے۔ پروگراموں کو ادھورا چھوڑنے اور نئے نئے پروگرام بنانے کی عادت سے بچئے۔ تھوڑا کام کیجیے لیکن مسلسل کیجیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

" بہترین عمل وہ ہے جو مسلسل کیا جاتا رہے، چاہے وہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔"

۶: دعوت و تبلیغ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں کا خندہ پیشانی

سے استقبال کیجیے اور صبر واستقامت دکھایئے۔ قرآن میں ہے:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ ۔ [لقمان: ۱۷]

" اور نیکی کا حکم دو، اور برائی سے روکو اور اس راہ میں جو مصائب بھی آئیں ان کو استقلال کے ساتھ برداشت کرتے رہو"۔

راہِ حق میں مصائب اور مشکلات کا آنا ضروری ہے، آزمائش کی منزلوں سے گزر کر ہی ایمان میں قوت آتی ہے اور اخلاق و کردار میں پختگی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کو ضرور آزماتا ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو اپنے دین وایمان میں جتنا زیادہ پختہ ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اسی لحاظ سے سخت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔[البقرۃ: ۱۵۵۔۱۵۷]

" اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ " ہم خدا ہی کے ہیں اور خدا ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے" انہیں خوش خبری دے دیجیے۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ سخت آزمائش کس شخص کی ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء کی، پھر جو دین وایمان میں ان سے زیادہ قریب ہو اور پھر جو اس سے قریب ہو۔ آدمی کی آزمائش اس کے دین کے اعتبار سے ہوتی ہے، پس جو شخص اپنے دین میں پختہ ہوتا ہے اس کی آزمائش سخت ہوتی ہے اور جو دین میں کمزور ہوتا ہے اس کی ازمائش ہلکی ہوتی ہے۔ اور یہ آزمائش برابر ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر گناہ کا کوئی

اثر نہیں رہ جاتا"۔ [مشکوٰۃ]

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: مجھے خدا کی راہ میں اتنا ستایا گیا کہ کبھی کوئی انسان اتنا نہیں ستایا گیا اور مجھے خدا کی راہ میں اتنا ڈرایا گیا کہ کبھی کوئی آدمی اتنا نہیں ڈرایا گیا اور ہم پر تیس (۳۰) شب وروز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال رضی اللہ عنہ کے کھانے کے لیے کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جاندار کھاسکے سوائے اس مختصر توشے کے جو بلال رضی اللہ عنہ کی بغل میں تھا۔" [ترمذی]

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا خدا اس کو صبر بخشے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔" [بخاری، مسلم]

دراصل آزمائشیں تحریک کو قوت پہنچانے اور آگے بڑھانے کا لازمی ذریعہ ہیں۔ آزمائشوں کی منزلوں سے گزرے بغیر کوئی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص وہ تحریک جو عالم انسانی میں ایک ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دیتی ہو اور پوری انسانی زندگی کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتی ہو۔

جس زمانے میں مکے کے سنگ دل لوگ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر بے پناہ ظلم وستم توڑ رہے تھے انہی دنوں کا ایک واقعہ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے سایے میں چادر سر کے نیچے رکھے آرام فرما رہے تھے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے خدا سے مدد طلب نہیں فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس ظلم کے خاتمے کی دعا نہیں کرتے۔ (آخر یہ سلسلہ کب تک دراز رہے گا اور کب یہ مصائب کا دور ختم ہوگا؟) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے بعض کے لیے گڑھا کھودا جاتا۔ پھر اس کو اُس گڑھے میں کھڑا کر دیا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اس کے جسم کو چیرا جاتا یہاں تک کہ اس کے جسم کو دو ٹکڑے کر دیے جاتے۔ پھر

بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتا اور اس کے جسم میں لوہے کے کنگھے چبھوئے جاتے جو گوشت سے گزر کر ہڈیوں اور پٹھوں تک پہنچ جاتے مگر وہ خدا کا بندہ حق سے نہ پھرتا۔ قسم ہے خدا کی، یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار (یمن کے دارالخلافے) صنعاء سے حضر موت تک کا سفر کرے گا اور راستے میں خدا کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا۔ البتہ چرواہوں کو صرف بھیڑیوں کا خوف رہے گا کہ کہیں بکری اٹھا نہ لے جائیں لیکن افسوس کہ تم جلدی مچا رہے ہو"۔ [بخاری]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ:

"میری امت میں برابر ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو خدا کے دین کا محافظ رہے گا۔ جو لوگ ان کا ساتھ نہ دیں گے اور جو لوگ ان کی مخالفت کریں گے وہ ان کو تباہ نہ کر سکیں گے یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے اور یہ دین کے محافظ لوگ اپنی اسی حالت میں قائم رہیں گے۔"

[بخاری و مسلم]

۷: بے جا رواداری، مداہنت اور اصولوں کی قربانی دینے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے۔

قرآن میں مؤمنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ

"وہ کافروں پر سخت ہوتے ہیں"

یعنی وہ اپنے دین اور اصولوں کے معاملے میں انتہائی شدید ہوتے ہیں۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے اصولوں کے معاملے میں کوئی مصالحت یا مداہنت نہیں کرتے۔ وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں لیکن دین واصول کی قربانی نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو خدا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہدایت دی ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ [الشوریٰ: ۱۵]

"پس آپ اسی دین کی طرف دعوت دیجیے اور جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اُسی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیے اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے۔"

دین کے معاملے میں مداہنت، بے جا رواداری اور باطل سے مصالحت وہ خطرناک

کمزوری ہے جو دین وایمان کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

" جب بنی اسرائیل خدا کی نافرمانیوں کے کام کرنے لگے تو ان کے علماء نے ان کو روکا لیکن وہ نہیں رکے (تو ان کے علماء ان کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے) ان کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے جب ایسا ہوا تو خدا نے ان سب کے دل ایک جیسے کر دیے اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے خدا نے ان پر لعنت کی۔

یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اور اسی میں بڑھتے چلے گئے۔ اس حدیث کے راوی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے بیٹھے تھے پھر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: " نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائی سے روکتے رہو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور ظالم کو حق کے آگے جھکاؤ گے اگر تم لوگ ایسا نہ کرو گے تو تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے اور پھر خدا تمہیں اپنی رحمت اور ہدایت سے دور پھینک دے گا جس طرح بنی اسرائیل کو اس نے محروم کر دیا۔

۸: اپنے بچوں کی اصلاح وتربیت اور ان کو اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینے کے لیے تیار کرنا آپ کا اولین فرض بھی ہے اور آپ کی سرگرمیوں کا فطری میدان بھی۔ اس میدان کو چھوڑ کر اپنی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کے لیے محض باہر میدان تلاش کرنا غیر حکیمانہ اور غیر فطری عمل ہے اور یہ بہت بڑی کوتاہی اور فرار ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ قحط کے زمانے میں اپنے گھر والوں کو بھوک پیاس سے نڈھال اور جاں بلب چھوڑ کر باہر کے ضرورت مندوں کو تلاش کر کے غلہ تقسیم کرنے کی فیاضی کا مظاہرہ کریں۔ گویا نہ تو آپ کو بھوک پیاس اور قرابت ومحبت کا احساس ہے اور نہ غلے کی تقسیم کی حکمت ہی سے آپ کا ذہن آشنا ہے۔ قرآن میں مؤمنون کو ہدایت دی گئی ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا

" مؤمنو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو جہنم کی آگ سے "۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

" تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے ان لوگوں کے بارے میں بازپرس کی جائے گی جو اس کی نگرانی میں ہوں گے۔ حاکم نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا اور شوہر اپنے گھر والوں کا نگران اور ذمہ دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی جو اس کی نگرانی میں دیے گئے ہیں۔ [بخاری و مسلم]

۹: اپنے پڑوسیوں اور محلے والوں کی اصلاح و تعلیم کی بھی فکر کیجیے اور اس کو بھی اپنا فریضہ سمجھئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں کچھ مسلمانوں کی تعریف فرمائی۔ پھر فرمایا: " ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا نہیں کرتے اور انہیں دین نہیں سکھاتے اور انہیں دین سے ناواقف رہنے کے عبرتناک نتائج نہیں بتاتے۔ اور انہیں برے کاموں سے نہیں روکتے؟ اور ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں سے دین کا علم حاصل نہیں کرتے اور دین کی سمجھ بوجھ پیدا نہیں کرتے اور دین سے جاہل رہنے کے عبرتناک نتائج معلوم نہیں کرتے۔ خدا کی قسم! لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً دین کی تعلیم دیں۔ ان کے اندر دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں۔ انہیں نصیحت کریں، ان کو اچھی باتیں بتائیں اور ان کو بری باتوں سے روکیں نیز لوگوں کو چاہیے کہ لازماً اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھیں، دین کی سمجھ پیدا کریں اور ان کی نصیحتوں کو قبول کریں ورنہ میں انہیں بہت جلد سزا دوں گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اُتر آئے اور تقریر ختم فرمادی:

سننے والوں میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے پوچھا، یہ کون لوگ تھے جن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی؟ دوسرے لوگوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن قبیلہ اشعر کے لوگوں کی طرف تھا۔ یہ لوگ دین کا علم رکھنے والے لوگ ہیں اور ان کے پڑوس میں چشموں پر رہنے والے دیہاتی اجڈ لوگ ہیں۔ جب اس تقریر کی خبر

اشعری لوگوں کو پہنچی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں کچھ لوگوں کی تعریف فرمائی اور ہمارے اوپر غصہ فرمایا تو فرمایئے ہم سے کیا قصور ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین کی تعلیم دیں، انہیں وعظ ونصیحت کریں، اچھی باتوں کی تلقین کریں اور بُری باتوں سے روکیں، اسی طرح لوگوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین کا علم حاصل کریں، ان کی نصیحتوں کو قبول کریں اور اپنے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں ورنہ میں بہت جلد ان لوگوں کو دنیا میں سزا دوں گا۔"

یہ سن کر قبیلہ اشعر کے لوگوں نے کہا: "اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم دوسرے لوگوں میں سمجھ پیدا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جی ہاں یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔" تو یہ لوگ بولے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایک سال کی مہلت دیجیے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک سال کی مہلت دی جس میں وہ اپنے پڑوسیوں کو دین سکھائیں اور دینی سمجھ پیدا کریں۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتیں تلاوت فرمائیں:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔

[المائدہ:۷۸]

"بنی اسرائیل کے کفر کرنے والوں پر لعنت کی گئی داؤد علیہ السلام کی زبان سے اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان سے اور یہ لعنت اس لیے کی گئی کہ انہوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اور برابر خدا کے احکام توڑتے چلے گئے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کو بری باتوں کے کرنے سے نہیں روکتے تھے۔ بلا شبہ ان کی یہ حرکت انتہائی بری تھی۔"

۱۰: جن لوگوں کے درمیان آپ دعوت و تبلیغ کا خوشگوار فریضہ انجام دے رہے ہوں، ان کے مذہبی معتقدات اور جذبات کا احترام ولحاظ کیجیے۔ نہ ان کے بزرگوں اور پیشواؤں کو برے نام سے یاد کیجیے، نہ ان کے معتقدات پر حملے کیجیے، نہ ان کے مذہبی نظریات

کی تحقیر کیجیے۔ مثبت انداز میں حکمت کے ساتھ اپنی دعوت پیش کیجیے اور تنقید میں بھی مخاطبین کو بھڑکانے کے بجائے نہایت دل سوزی کے ساتھ ان کے دل میں اپنی بات اتارنے کی کوشش کیجیے۔ اس لیے کہ جذباتی تنقید اور توہین آمیز گفتگو سے مخاطب میں کسی خوشگوار تبدیلی کی توقع نہیں ہوتی۔ البتہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں حمیتِ جاہلیت اور تعصب کے ہیجان میں وہ خدا اور دین کی شان میں گستاخی کرنے لگے اور دین سے قریب آنے کے بجائے وہ اور زیادہ دین سے دور ہو جائے۔

قرآن کی ہدایت ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ [الانعام:۱۰۸]

"اے مؤمنو! یہ لوگ خدا کے سوا جن کو پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو، ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر خدا کو گالیاں دینے لگیں۔"

۱۱: "داعی الی اللہ بن کر دعوت کا فریضہ انجام دیجیے۔ یعنی صرف اللہ کی طرف دعوت دینے والے بنیں۔ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف ہر گز نہ بلایئے، نہ وطن کی طرف بلایئے نہ قوم اور نسل کی طرف، نہ کسی زبان کی طرف دعوت دیجیے، نہ کسی جماعت کی طرف، مؤمن کا نصب العین صرف خدا کی رضا ہے، اسی نصب العین کی طرف دعوت دیجیے اور یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کیجیے کہ بندے کا کام محض یہ ہے کہ وہ اپنے خالق ومالک کی بندگی کرے، اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور خانگی زندگی میں بھی، سماجی زندگی میں بھی اور ملکی معاملات میں بھی، غرض پوری زندگی میں اپنے مالک اور پروردگار کے کہنے پر چلے اور اس کے قانون کی مخلصانہ پیروی کرے۔ اس کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کو مسلمان اپنا نصب العین قرار دے۔ اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔ مؤمن جب بھی خدا کی ہدایت سے منہ موڑ کر خدا کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو اپنا نصب العین قرار دے گا۔ دونوں جہان میں ناکام ونامراد ہوگا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ [الانعام]

" اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف دعوت دی، اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں خدا کا فرمانبردار اور مسلم ہوں۔"

نظم جماعت کے آداب :

ا: دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے لئے مضبوط تنظیم وجود میں لایئے اور اقامت دین کے لئے اجتماعی جدوجہد کیجیے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

[العمران]

"اور تم میں ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے"۔

"الخیر" سے مراد ہر وہ فطری بھلائی ہے جسے ہمیشہ انسانی فطرت نے بھلائی سمجھا ہے اور جس کی بھلائی ہونے کی شہادت آسمانی کتابوں نے دی ہے، ان تمام بھلائیوں اور خوبیوں کی ایک جامع اور مرتب شکل خدا کا بھیجا ہوا وہ دین ہے جو ہر دور میں خدا کے پیغمبر لاتے رہے ہیں جس کی آخری، مستند اور محفوظ شکل وہ کتاب وسنت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دیے گئے ہیں۔ اسی خیر کی طرف دعوت دینے اور بھلائیوں سے دنیا کو مالا مال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان جماعت بن کر منظم طور پر اس کام کو انجام دیں اور زندگی کے ہر میدان میں باطل پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے مضبوط اجتماعیت وجود میں لائیں اور انتہائی منظم جدوجہد کریں۔ خدا نے مؤمنوں کی اس مضبوط اجتماعیت اور اجتماعی جدوجہد کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی مثالی اجتماعیت کی تعریف کی ہے اور ان کو اپنا محبوب قرار دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔

"بلا شبہ وہ لوگ خدا کے محبوب ہیں جو اس کی راہ میں استقلال کے ساتھ صف باندھے لڑتے رہتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی زندگی کی اہمیت اور جماعت بن کر زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "تین آدمی جو کسی جنگل میں رہتے ہوں، ان کے لئے جائز

نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے میں سے کسی کو اپنا امیر منتخب کر لیں"۔ [شعبی]

اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"جو شخص جنت کے وسط میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہوا سے "الجماعت" سے چمٹا رہنا چاہیے۔اس لیے کہ شیطان ایک آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہ دو ہو جاتے ہیں تو وہ دور بھاگ جاتا ہے"۔"الجماعت" سے مراد مسلمانوں کی ایسی منظم اجتماعیت ہے،جب اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اور مسلمان خلیفہ اسلامی احکام و قوانین نافذ کر رہا ہو اور سارے اہل اسلام اس کی قیادت ورہنمائی پر متفق ہوں ،ایسی حالت میں کسی مسلمان کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ وہ جماعت سے الگ رہ کر زندگی گزارے اور جب یہ "الجماعت" موجود نہ ہو تو امت کا فرض ہے کہ وہ منظم ہو کر اجتماعی جدوجہد کے ذریعے اس "الجماعت" کو وجود میں لانے کی کوشش کرے۔

۲: اتحاد و تنظیم کی بنیاد صرف دین کو بنائے۔اسلامی تنظیم وہی ہے جس کی بنیاد خدا کا دین ہو۔خدا کے دین کو چھوڑ کر کسی اور بنیاد پر مسلمانوں کا اتحاد واتفاق ،وہ اتحاد نہیں ہے جس کا حکم اسلام نے دیا ہے اور ایسی تنظیم وجماعت در حقیقت اسلامی تنظیم نہیں ہے۔ مسلمانوں میں حقیقی رشتۂ اُخوت واتحاد صرف دین ہے۔دین کے سوا جس چیز کو بھی یہ اپنے اتحاد کی بنیاد بنائیں گے متحد ہونے کے بجائے منتشر ہوں گے اور ایک "الجماعت" بننے کے بجائے گروہ، گروہ اور فرقہ ،فرقہ بن جائیں گے۔جماعت بنایئے تو صرف اس لیے کہ خدا کا دین قائم کرنا آپ کا نصب العین ہو اور آپ کی ساری تگ ودو محض اسی کی خاطر ہو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ [آل عمران : ۱۰۳]

"اور تم سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا،اور الگ الگ فرقے نہ بن جانا اور خدا کے اس احسان کو یاد رکھنا جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے"۔

خدا کی رسی سے مراد خدا کا دین، اسلام ہے، قرآن کے نزدیک مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت کی بنیاد یہی دین ہے اسکے سوا کوئی بھی بنیاد مسلمانوں کو جوڑنے والی نہیں بلکہ پارہ پارہ کر دینے والی ہے۔

۳: دعوت حق کے کارکنوں سے دلی محبت کیجیے اور اس رشتے کو ہر رشتے سے زیادہ اہم اور قابل احترام سمجھیں۔ قرآن میں مؤمنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَهُمۡ۔ [المجادلہ: ۲۲]

"تم اس گروہ کو جو خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے ان لوگوں سے محبت اور الفت کرتے نہ دیکھو گے جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور مخالفت پر کمر بستہ ہوں، چاہے وہ اس کے اپنے ہی باپ یا اپنے ہی بیٹے یا اپنے ہی بھائی یا اپنے ہی خاندان والے کیوں نہ ہوں"۔

۴: جماعتی رفقاء کی نصح وخیر خواہی کا اہتمام کیجیے اور جماعتی زندگی میں باہمی تلقین کے جذبے کو بیدار رکھیے۔ اس لیے کہ یہی کامیابی کی ضمانت ہے:

وَالۡعَصۡرِ۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ۔ [سورۃ العصر]

"زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جو نیک عمل کرتے رہے، اور جو ایک دوسرے کو دین حق کی وصیت کرتے رہے اور صبر وثبات کی تلقین کرتے رہے"۔

۵: جماعتی نظم کی پوری پوری پابندی کیجیے اور اس کو محض جماعتی استحکام کا ذریعہ ہی نہ سمجھیں، بلکہ دینی فریضہ تصور کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاِذَا كَانُوۡا مَعَهٗ عَلٰۤی اَمۡرٍ جَامِعٍ لَّمۡ یَذۡهَبُوۡا حَتّٰی یَسۡتَاۡذِنُوۡهُ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ۔ [النور: ۶۲]

"مؤمن تو حقیقت میں وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

دل سے مانیں ،اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں ،تو ان سے اجازت لئے بغیر نہ جائیں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیتے ہیں وہی لوگ خدا اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے ہیں۔"

نظم جماعت کی پابندی اور اپنے قائد کی اطاعت وفرمانبرداری محض ایک قانونی معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اہم شرعی معاملہ ہے اور قرآن پاک نے ان لوگوں کے ایمان کی سچائی کی شہادت دی ہے جو نظم جماعت کی پابند ہوں اور کسی جماعتی ڈیوٹی سے اسی وقت ہٹیں جب اپنے سربراہ کار سے اجازت حاصل کرلیں۔

۶: جماعتی زندگی میں نیکی کے جو کام بھی ہو رہے ہوں، خلوص دل سے اس میں تعاون کیجیے اور جو کچھ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کیجیے۔ خود غرضی ، مطلب برآوری اور خود پرستی جیسے گندے جذبات سے اپنا اخلاقی دامن پاک رکھیے۔ قرآن کی ہدایت ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

"اور نیکی اور خداپرستی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو"۔

۷۔ رفقاء سے تعلقات خوش گوار رکھیے اور کبھی کسی سے کوئی اختلاف ہوجائے تو فوراً صلح صفائی کر لیجیے اور دل کو کدورت سے پاک رکھیے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ

"پس خدا سے ڈرو، اور آپس کے تعلقات کو خوش گوار رکھو"۔

۸: اسلامی جماعت کے امیر کی خوش دلی کے ساتھ اطاعت کیجیے اور اس کے خیر خواہ اور وفادار رہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مسلمانوں کو اپنے ذمہ دار کی بات سننی اور ماننی ضروری ہے، چاہے وہ حکم اپنی طبیعت کے لئے خوشگوار ہو یا ناخوشگوار بشرطیکہ وہ خدا کی نافرمانی کی بات نہ ہو، ہاں! جب خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو وہ بات نہ سننی چاہیے اور نہ ماننی چاہیے۔ [بخاری ومسلم]

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دین مخلصانہ خیر خواہی اور وفاداری کا نام ہے"... تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات دہرائی۔ ہم لوگوں نے پوچھا: "کس کی خیر خواہی اور وفاداری" ارشاد فرمایا: خدا کی، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کی کتاب کی، مسلمانوں کی ذمہ داروں کے اور عام مسلمانوں کی وفاداری" [مسلم]

۹: جماعتی عصبیت، تنگ نظری اور دھڑے بندی سے پرہیز کیجیے۔ کشادہ دلی اور خوش اخلاقی کے ساتھ ہر ایک سے تعاون کیجیے اور جو لوگ بھی دین کا کام کر رہے ہوں ان کی قدر کیجیے۔ ان کے ساتھ خیر خواہی اور اخلاص کا برتاؤ کیجیے اور ان کو اپنے رفیق سفر اور معین کار سمجھیں۔ دین کا کام کرنے والے در حقیقت سب ایک دوسرے کے ناصر وحامی ہیں۔ سب کا مطلوب دین ہے اور سب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق دین کی خدمت ہی کرنا چاہتے ہیں۔ خلوص کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے ایک دوسرے کی غلطی واضح کرنا اور صحیح طرزِ فکر و عمل کی نشاندہی کرنا تو ایک نہایت ہی مبارک عمل ہے اور یہ ہونا ہی چاہیے۔ البتہ باہمی منافرت، کشیدگی بغض وعناد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا، وہ طرز عمل ہے جو کسی طرح بھی داعیان دین کے شایان شان نہیں ہے اور ان لوگوں کا دامن اس طرح کے داغوں سے بالکل ہی صاف ہونا چاہیے جو واقعی دل کی گہرائی سے یہ چاہتے ہیں کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی راہ میں لگائیں اور زندگی میں خدا کے دین کی کچھ خدمت کر جائیں۔

قیادت کے آداب:

۱: اسلامی جماعت کی قیادت اور رہنمائی کے لیے ایسے شخص کو منتخب کیجیے جو خدا ترسی اور پرہیزگاری میں سب سے بڑھا ہوا ہو، دین میں بزرگی اور بڑائی کا معیار نہ مال و دولت ہے نہ خاندان بلکہ دین میں وہی شخص سب سے افضل ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ [الحجرات]

"اے انسانوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ تمہارے کنبے اور قبیلے بنائے تاکہ تم باہم پہچانے جاؤ۔ بلا شبہ خدا کے نزدیک تم سب میں زیادہ معزز اور مکرم وہ ہے جو تم سب میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے"۔

۲: قیادت کے انتخاب کو ایک خالص دینی فریضہ سمجھیں اور اپنی رائے کو خدا کی امانت سمجھتے ہوئے صرف اسی شخص کے حق میں استعمال کیجیے جس کو آپ واقعی اس بار گراں کو اٹھانے اور اس کا حق ادا کرنے کے لائق سمجھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ [النسا: ۵۸]

"بلا شبہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اپنی امانتیں انہی کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں"

یہ ایک اصولی اور جامع ہدایت ہے، جو ہر طرح کی امانتوں پر حاوی ہے اور سلسلۂ بیان میں امانتوں سے مراد اسلامی جماعت کہ ذمہ داریاں ہیں یعنی اسلامی جماعت کی قیادت اور رہنمائی کے لئے اپنی رائے اور پسند کی امانت اسی اہل تر شخص کے حوالے کیجیے جو واقعی اس بار امانت کو اُٹھانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہو، اس معاملے میں جانب داری یا بے جا رواداری اور اسی طرح کے دوسرے عوامل سے متاثر ہو کر رائے دینا خیانت ہے جس سے مومن کا دامن پاک ہونا چاہیے۔

۳: اگر آپ مسلمانوں کی جماعت کی ذمہ داری سنبھالیں تو اپنے فرائض کا پورا پورا شعور رکھیے اور کامل دیانت، محنت، احساس ذمہ داری اور تن دہی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی امور کا ذمہ دار ہو اور وہ ان کے ساتھ خیانت کرے تو خدا اس پر جنت حرام کر دے گا"۔ [بخاری، مسلم]

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"جس شخص نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی ذمہ داری قبول کی پھر اس نے ان

کے ساتھ خیر خواہی نہ کی اور ان کے کام انجام دینے میں اپنے آپ کو اس طرح نہیں تھکایا جس طرح وہ اپنی ذاتی ضرورت کے لئے خود کو تھکاتا ہے تو خدا اس شخص کو منہ کے بل جہنم میں گرادے گا"۔ [طبرانی]

۴: اپنے مامورین کے ساتھ نرمی، شفقت، انصاف اور بردباری کا برتاؤ کیجیے تاکہ وہ کھلے دل سے آپ کے ساتھ تعاون کریں اور خدا آپ کی جماعت کو اپنے دین کی کچھ خدمت کرنے کی توفیق بخشے۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہا گیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ [العمران]

"یہ خدا کی رحمت ہی تو ہے کہ آپ ان لوگوں کے لئے انتہائی نرم دل ہیں ورنہ اگر کہیں آپ سخت مزاج اور سخت گیر ہوتے تو یہ سب آپ کے گردوپیش سے چھٹ جاتے"۔

اور آپ کو تاکید کی گئی ہے:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ [الشعراء]

"اور آپ اپنے شفقت کے بازو پھیلا دیجیے ان مؤمنوں کے لئے جو آپ کی پیروی کر رہے ہیں"۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بار تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اے لوگو! ہمارا تم پر حق ہے کہ بیٹھ پیچھے، ہماری مخلصانہ خیر خواہی کرو اور نیکی کے امور میں ہماری مدد کرو"۔ پھر ارشاد فرمایا: "اے حکومت کے ذمہ دارو! سربراہ کی بُردباری اور نرمی سے زیادہ نفع بخش اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور کوئی بردباری نہیں ہے۔ اسی طرح سربراہ کی ناسمجھی اور جذباتیت اور بغیر سوچے سمجھے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور ناپسندیدہ کوئی دوسری نادانی اور بدسلیقگی نہیں ہے"۔

۵: اپنے رفقاء کی اہمیت محسوس کیجیے۔ ان کے جذبات کا احترام کیجیے، ان کی ضرورتوں کا احساس کیجیے اور ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کیجیے کہ وہ آپ کو اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھیں۔

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ایک بار ہم کچھ ہم عمر نوجوان نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کے لئے پہنچے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیس رات تک رہے، واقعی خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نرم دل اور رحیم تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ اب ہمیں گھر والوں کی یاد ستا رہی ہے تو ہم سے پوچھنے لگے تم لوگ اپنے پیچھے گھر میں کن کن لوگوں کو چھوڑ کر آئے ہو؟ ہم نے تفصیل بتائی تو فرمایا: "اچھا تو اب تم لوگ اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور انہی کے ساتھ رہو اور جو کچھ تم نے سیکھا ہے اس کو سکھاؤ، اور انہیں نیک باتوں کی تلقین کرو اور فلاں نماز فلاں وقت پڑھو، اور فلاں نماز فلاں وقت پڑھو اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان دے دے اور جو تم میں علم و کردار کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہو وہ نماز پڑھائے"۔

۶: اپنے رفقاء کی قدر کیجیے، اور انہی کو اپنا اصل سرمایہ سمجھتے ہوئے پوری تن دہی اور دلسوزی کے ساتھ ان کی تربیت کیجیے اِن کو نادار اور مفلس سمجھ کر اُن لوگوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھئے جن کو خدا نے دنیوی شان و شوکت اور مال واسباب دے کر ڈھیل دی ہے"۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ [الکہف:۲۸]

"اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت اور رفاقت پر مطمئن رکھیے جو اپنے رب کی رضا کے طالب بن کر صبح وشام اس کو پکارتے رہتے ہیں اور ان کو نظر انداز کر کے دنیوی شان و شوکت کی طلب میں اپنی نگاہیں نہ دوڑایئے"۔

در حقیقت دینی جماعت کا اصل سرمایہ وہی لوگ ہیں جو تن، من، دھن سے دین کی تبلیغ واشاعت میں لگ گئے ہیں۔ جماعت کے قائد کا فرض ہے کہ ان کی اہمیت کا احساس کرے اور اپنی ساری توجہ انہی کی تربیت اور تیاری پر مرکوز رکھے۔

۷: جماعت کے سارے اہم کام رفقاء کے مشورہ سے طے کیجیے اور انجام دیجیے اور رفقاء کے مخلصانہ مشوروں سے فائدہ اٹھا کر جماعت کے کاموں سے ان کا لگاؤ اور شغف بڑھایئے۔ مومنوں کی صفت خدا نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ان کے معاملات باہمی

مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔[العمران]

"اور ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پاتے ہیں"۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۔[العمران]

"اور خاص معاملے میں ان سے مشورہ کیجیے"۔

۸: جماعتی معاملات میں ہمیشہ فراخ دلی اور ایثار سے کام لیجیے، اپنے اور اپنے گھر والوں کو کسی معاملے میں ترجیح نہ دیجیے۔ بلکہ ہمیشہ ایثار اور فیاضی کا برتاؤ کیجیے تاکہ رفقاء خوش دلی کے ساتھ ہر قربانی دینے کے لئے پیش پیش رہیں اور ان میں جماعت سے بد دلی اور بے تعلّقی نہ پیدا ہو اور نہ خود غرضی اور مطلب بر آوری کے جذبات اُبھرنے پائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

"اے خطاب کے بیٹے! میں نے مسلمانوں پر تمہیں اس لیے منتخب کیا ہے کہ تم ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کرو۔ تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، تم نے دیکھا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ہم کو اپنے اُوپر ہمارے گھر والوں کو اپنے گھر والوں کے اوپر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو جو کچھ آپ کی طرف سے ملتا۔ اس میں سے کچھ بچ جاتا تو وہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ [کتاب الخراج]

۹: جانب داری اور خویش پروری سے ہمیشہ بچتے رہیے اور بے جا مروت اور رواداری سے بھی پرہیز کیجیے۔ حضرت یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے سپہ سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا تو اس وقت یہ نصیحت فرمائی:

"اے یزید! تمہارے کچھ عزیز اور رشتہ دار ہیں، ہوسکتا ہیں کہ تم ان کو کچھ ذمہ داریاں دینے میں ترجیح دینے لگو۔ تمہارے لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ اندیشے اور خوف کی بات یہی ہے"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی امور کا ذمہ دار ہو

اور وہ مسلمانوں پر کسی کو محض رشتہ داری کی بنا پر یا محض دوستی کی وجہ سے حکمران بنائے تو خدا اس کی طرف سے کوئی فدیہ قبول نہ کرے گا یہاں تک کہ جہنم میں ڈال دے گا"۔

[کتاب الخراج]

۱۰: جماعت کے نظم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھنے کی کوشش کیجیے اور کبھی اس معاملے میں بے جا نرمی اور ڈھیل سے کام نہ لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَنْ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ۔ [النور: ۶۲]

"جب وہ اپنے کسی خاص کام کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو چاہیں اجازت دے دیا کریں، اور ان لوگوں کے حق میں خدا سے استغفار کیا کریں"

یعنی جب جماعت کے رفقاء کسی اجتماعی ضرورت کے لئے جمع ہوں اور پھر بعض لوگ اپنی نجی ضرورت اور معذوریوں کی وجہ سے اجازت مانگنے لگیں تو سربراہِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ نظمِ جماعت کی اہمیت کے پیش نظر صرف انہی لوگوں کو اجازت دے جن کی ضرورت واقعی اس اجتماعی دینی کام کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہو یا جن کی معذوری واقعی شرعی معذوری ہو اور اس کا قبول کرنا ضروری ہو۔

باب:۵

دعوت وجہاد کے داعی اور کارکن کیسے ہوں؟

دعوت وجہاد کی تحریک سے وابستہ داعیان اور کارکنان اپنی تحریر و تقریر میں اکثر خلافت وامارت، اس کے قیام اور اس کی برکات و فوائد کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر ہم امارت اسلامی پر گفتگو کرنا چاہیں تو اس کے دو معنیٰ نکلتے ہیں:

۱: ایک یہ کہ امارت اسلامی کا بالفعل قیام ہو اور امارت اسلامی موجود ہو تو اس کا طریقہ کار کیا ہو۔ اس کو کیسے چلانا چاہئے؟

۲: امارتِ اسلامی کا اس زمین کے اوپر اور ہمارے اس خطے کے اوپر بالفعل وجود نہیں تو پھر ہمیں کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ کہ آخر امارتِ اسلامی قائم ہو جائے۔ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے اور اللہ کی زمین کے اوپر اللہ کا حکم نافذ ہو جائے۔

ہماری گفتگو کا تعلق مؤخر الذکر معانی سے ہے۔ ہماری گفتگو کا تعلق اب اسی بات سے ہے کہ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور خصوصاً کس نظم اور کس طریقے پر چلنا چاہیے؟؟ کہ بالآخر اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ اور قانون جاری ہو جائے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہماری دعوت محض اسلامی حکومت کے قیام پر منحصر نہیں ہے کہ جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہو جائے ہم دعوت کے باقی کاموں کو فراموش کر دیں، یا اسے معطل کر دیں جیسا کہ ہمارے بعض نادان بھائیوں نے دین کا مقصد صرف انقلاب یا حکومت کی تبدیلی بنا لیا ہے اور صرف اسی ایک مقصد میں الجھ کر رہ گئے۔ تو یاد رکھئے! یہ انبیاء کی فکر نہیں اور نہ ہی یہ ہماری دعوت ہے، ہماری دعوت اور تمام انبیاء کی فکر یہ ہے کہ ہم اللہ کریم کے ہو جائیں، اسی کی عبادت کو اپنے نفس پر اور اپنے معاشرے پر..... صحیح سمجھ اور شعور کے ساتھ قائم کریں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو اپنی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں نافذ کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحتیں بروئے کار لائیں۔ جب عملی صورت میں ایسا ہو جائے گا تو پھر آپ دیکھیں گے کہ اسلام حکومت کے اندر بھی اور عام آدمی کی زندگی میں بھی ہر جگہ صحیح نافذ نظر آئے گا.....

اور یہ اللہ کا وعدہ ہے:

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ [الفتح:۲۸/۴۸]

" اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ اس دین حق کو تمام دینوں پر غالب اور بلند کر دے۔"

وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا اور اللہ تعالیٰ اس بات کے اوپر گواہ ہے۔ جانتا ہے اور مطلع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو کس طرح غالب کرنا ہے۔ تو اس کے بعد والی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ طریقہ بتلایا ہے جس کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس دین کو اس دنیا میں تمام ادیان باطلہ پر غالب کیا اور ہمیں بھی بحیثیت وارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے اور وارث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہونے کے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ تو سب سے پہلی بات جو کسی بھی جماعت یا افراد کے لیے دستوری حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر اللہ کے دین کو غالب کیا جاسکے۔ تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ اور طریقہ ہے۔ اگر ہم کہلائیں مسلمان، لیکن اپنے انفرادی، اجتماعی یا سیاسی معاملات میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کریں۔ نام اسلام کا لیں، لیکن نافذ کوئی اور نظام کر دیں، تو ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین حق پر نہیں رہ سکتے۔

اپنا قانون اور نظام صرف کتاب وسنت کو بنائیں:

وہ جماعت جس کے ذریعے اللہ رب ذوالجلال دین کو غالب کرتے ہیں، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا آئین اور دستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل کردہ وحی ہو۔ وحی کے اندر صرف دو چیزیں آتی ہیں، ایک قرآن مجید اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ قرآن کے اندر کئی جگہ پر آپ کو اس چیز کا صریح حکم ملے گا۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ [الاعراف: ۳/۷]

"کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔"

ہمارے پروردگار کی طرف سے کون سی چیز اتاری گئی ہے؟ کیا وہ دو، چار یا دس ہیں یا اس سے بھی زیادہ..... نہیں !..... یہ صرف اور صرف دو چیزیں ہیں، جو {مَا اُنْزِلَ} کی مصداق ہیں۔ ایک اللہ کا قرآن ہے اور دوسری محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس لیے وہ جماعت اور وہ لوگ جو اللہ کے دین کو تمام ادیانِ باطلہ کے اوپر غالب کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے سب سے پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ صرف وحی کو اور نظام رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور دوسرے لفظوں میں صرف قرآن وسنت کو، اپنا دستور اور اپنا قانون بنالیں۔ کتاب وسنت کے سوا اور کسی چیز کو اپنا قانون نہ بنائیں، نہ سوشلزم کو، نہ جمہوریت کو، اور نہ کمیونزم۔ ہمارا قانون اور نظام صرف کتاب وسنت اور شریعت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

اب جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا دین اور ہمارا قانون صرف کتاب وسنت ہے، تو اب ہمیں اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کرنے کے لئے یہ جاننا چاہیے کہ اس کے لئے وہ کون سے تقاضے اور مطالبے ہیں جو ہمیں پورے کرنے ہیں۔ دیکھئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ [الجمعۃ: ۳/۶۲]

"کہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔"

کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد کیا ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ "الرسالۃ" کے اندر فرماتے ہیں کہ: "میں جتنے بھی اہل علم کو ملا ہوں۔ جتنے بھی علماء کرام اور اصحاب فقہ سے میری ملاقات ہوئی ہے، ان سب کو میں نے اس بات پر متفق پایا ہے کہ حکمت سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے"۔ تو اس نبی کی بعثت اور آمد کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وسنت کی تعلیم دے"۔

ہر ایک داعی کتاب وسنت کا ضروری علم سیکھے:

مذکورہ بالا آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ اسلام کے پیروکار ہیں، ان کے پاس کتاب وسنت کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے جو لوگ دعوت وجہاد اور خلافت وامارت کے داعی ہیں (جو لوگوں میں دعوت کا کام کرتے ہیں)، ان کے لئے اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

میرے بھائیو.....! سب سے پہلے ہم داعی افراد کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کو سیکھیں۔ صرف اپنا یہ ایک نعرہ ہی نہ بنالیں کہ "ہم کتاب وسنت کو نافذ کریں گے" اور اس کو نافذ کرکے رہیں گے، خون دے دیں گے، یہ کریں گے وہ کریں گے" یہ صرف نعرے کی حد تک محدود نہ ہو، بلکہ بالفعل ہمیں قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دیکھنا بھی چاہیے۔ عام طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علماء کا کام ہے اور یہ ان دینی مدارس کے طلباء کا کام ہے جو آٹھ سال کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ چیز پسند نہیں۔ دیکھئے! کتاب وسنت کا اتنا علم اور اتنی تعلیم جو ہر شخص کے اوپر فرض ہے۔ اس قدر سیکھنا ہر فرد کے اوپر لازمی ہے، خواہ وہ جاہل ہو یا عالم ہو، جس کا تعلق اس کے عمل کے ساتھ ہے، اتنی مقدار میں علم کا حاصل کرنا ہر شخص کے اوپر فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔ [ابن ماجہ]

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"

یہاں میں مسلمات کا لفظ اس لیے نہیں لایا کہ صحیح احادیث میں یہ لفظ نہیں آتا۔ یہاں مطلق لفظ مسلم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ کتنا علم فرض ہے؟ اب ہم یہ کہہ دیں کہ قرآن مجید تو علماء کے لئے ہے طلبہ کے لئے، اور سنت کا سیکھنا یہ بھی علماء یا دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ہے۔ ہمارے لئے کون سا کورس ہے؟ کون سا نصاب ہے؟ جماعت کے ہر فرد کو یہ جان لینا چاہیے کہ قرآن مجید کا اتنا علم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور فقہ کا اتنا علم جس کا تعلق ہر شخص کے اعمال، اس کی ذاتیات اور اس کے کردار کے ساتھ ہے، جو چوبیس گھنٹے کی زندگی کے احکام کو جان لے۔ کم از کم

اتنا علم کتاب وسنت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اور جماعت کے سرکردہ حضرات کو چاہیے کہ ایک نصاب مقرر کریں جو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ اور فقہ سے منتخب کیا گیا ہو۔ ہر فرد کے لئے اس کو سیکھنا اور اس کو حاصل کرنا ضروری ہو۔

اپنا تزکیہ شرعی طریقہ پر کریں:

دوسری بات میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ [البقرہ: ۱۲۹/۲]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد ہے۔ { يُزَكِّيهِمْ } لوگوں کا تزکیہ کرنا اور تزکیہ کس سے ہوتا ہے؟ تو تزکیہ محض قرآن وسنت کو دیکھنے سے نہیں ہو جاتا یا قرآن مجید کو حفظ کر لینے سے نہیں ہوتا۔ یہ تزکیہ اس طرح ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو، اپنی پوری زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھال لے۔ اس کی شکل وصورت اس کا رہن سہن، اس کی گھریلو زندگی، اس کی معاشرتی زندگی اور اس کی تجارتی زندگی، یعنی شب وروز اس کی زندگی میں کتاب وسنت کی واضح چھاپ نظر آئے۔ یہ معنی ہے۔ { وَيُزَكِّيهِمْ } کا اور یاد رکھئے یہ تزکیہ کتاب وسنت سے ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ دل کا کوئی مخصوص تزکیہ ہوتا ہے، کوئی خاص وظیفے ہوتے ہیں، یا کوئی چلہ ہے یا کوئی خاص کورس ہے، یا کچھ بنے بنائے طریقے ہیں، غلط صوفیوں کے خودساختہ طریقوں سے دل کا تزکیہ ہرگز نہیں ہوتا۔ دل کے تزکیے کا اور انسان کے تزکیے کا جو واحد طریقہ ہے وہ اپنی زندگی کے اوپر، اپنے گھر کے اوپر اور اپنے معاشرے کے اوپر، صرف اور صرف کتاب وسنت کا بالفعل نفاذ ہے، اسی سے انسان کا تزکیہ ہوتا ہے اور اسی سے انسان میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اہل اللہ کی صحبت اور رہنمائی ضروری ہے۔

ہمیشہ جیب میں چھوٹا قرآن مجید رکھیں:

میں نے افغانستان کے محاذوں پر مجاہدین خصوصاً عربی مجاہدین کی یہ ایک بڑی اچھی عادت نوٹ کی کہ ان کی جیب میں ہمیشہ چھوٹا سا قرآن مجید ہوتا ہے۔ جب کہ ہماری مساجد کو دیکھیں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب دو منٹ کو موقع ملے، دس منٹ کا موقع ملے مسلسل

باتیں کرتے ہیں، گپیں ہانکتے ہیں، خواہ مسجدیں ہوں، اجتماعات ہوں یا اور کسی بھی جگہ ہوں۔ لیکن میں نے عربی بھائیوں کو دوران جہاد افغانستان کی زمین میں بھی اور عرب میں بھی دیکھا کہ ان کی جیب میں ایک چھوٹا سا قرآن مجید ضرور ہوتا ہے، سب سے زیادہ لگن ان کو قرآن مجید سے ہوتی ہے، جب بھی ان کو تھوڑا سا بھی فارغ وقت ملے وہ قرآن مجید کو کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ ایک تعلق ہے قرآن مجید کے ساتھ، لیکن اب مجھے نہیں پتہ کہ دعوت وجہاد کے اس کاروان سے منسلک آپ بھائیوں نے یہ التزام کیا ہے کہ ان کے پاس ان کی جیبوں میں بھی ایک قرآن مجید ہو، جب بھی ان کو موقع ملے فرصت کے لمحات میں، یہ قرآن مجید کو کھولیں۔۔۔تلاوت کریں۔ یاد رکھیں! جب تک ہم یہ سب چیزیں اپنے اندر پیدا نہیں کریں گے، اتنی دیر تک اس جماعت کے افراد میں شامل نہیں ہوں گے۔ جس کے ذریعہ سے اللہ رب العزت زمین پر اپنے کلمے کو غالب کرنا چاہتے ہیں۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی صفت پیدا کریں:

میرے بھائیو! اس کے بعد چوتھی صفت جو ہمارے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ:

دعوت دین کا کام کرنے والے {اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ} [الفتح:۴۸/۲۹] "کافروں پر سخت اور اپنوں پر رحم دل اور نرم گوشہ رکھنے والے ہوں" کا نمونہ ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی پاکیزہ زندگیاں اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہیں وہ اسلام کے دشمنوں پر تو سخت مگر اپنوں پر رحمدل تھے۔ جب بعض وجوہات کی بنا پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات میں رنجش و ناراضگی پیدا ہو گئی تو قیصر روم نے چاہا کہ مسلمانوں کی باہمی رنجش سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس نے ان پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن جب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان حالات کی خبر ہوئی تو انہوں نے قیصر روم کے نام یوں خط لکھا: "اگر تم نے اپنا ارادہ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر حملہ) پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم اٹھاتا ہوں کہ اپنے ساتھی (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) سے صلح کر لوں گا پھر تمہارے خلاف ان کا جو لشکر روانہ ہوگا اس کے ہراول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا ڈالوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح کاٹ پھینکوں گا۔[تاج العروس]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ۔ [ابوداؤد]

کہ جس شخص کے اندر یہ چار چیزیں پیدا ہو جائیں یعنی

- محبت ہو تو اللہ کے لئے
- کسی سے عداوت ہو، نفرت و بغض ہو تو اللہ کے لئے
- کسی کو دینا ہے تو اللہ کے لئے
- اگر کسی کو نہیں دینا تو یہ بھی اللہ کے لئے

جب یہ چار چیزیں پیدا ہو جائیں گی تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا، دین کی تکمیل کے لئے ضروری ہے جو ایک دعوت میں منسلک ہیں اور آپ کی فکر کے حامل ہیں، آپ انہیں اپنا بھائی سمجھیں دراصل یہی آپ کے حقیقی بھائی ہیں، انہی سے آپ کی محبت ہونی چاہیے، آپ کا تعلق انہی سے ہونا چاہیے، انہی میں آپ کے رشتے اور ناطے ہونے چاہئیں۔ اس طرح آپ یہ ثابت کر دیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک دین اور ایک عقیدے کے حامل ہیں۔ اور ایک ہی دعوت و پیغام کے داعی ہیں۔

الولاء والبراء کی صفت سے ہم محروم کیوں؟

میرے بھائیو! افسوس یہ ہے کہ الولاء والبراء یعنی اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے کسی سے برأت اور عداوت، یہ اسلام اور ایمان کا بنیادی عقیدہ تھا جس کو ہم نے چھوڑ دیا ہے اور یہ ایسا عقیدہ اور اہم فرض تھا۔ جس کے متعلق اللہ ذوالجلال فرماتے ہیں:

اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ۔ [الانفال: ۸/۷۳]

اگر تم اللہ کے لئے محبت نہیں کروگے، اگر تم کافروں سے دشمنی نہیں رکھوگے، اپنے مومن بھائیوں سے تعاون اور ان سے محبت کی روش اختیار نہیں کروگے، تو پھر اس دنیا میں فساد اور فتنہ برپا ہو جائے گا۔ یہ جماعت حقہ کی صورت نظر ہی نہیں آئے گی۔ کہ یہ کون سے لوگ ہیں؟ جو ایک دین اور ایک عقیدے کے قائل اور حامل ہیں۔ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھیں۔ سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینے کے سب سے پہلے معلم اور

داعی ہیں۔ مدینے کی گلیوں میں ان کی دعوت سے نور اسلام پھیلا ہے۔ جنگ بدر میں ان کا ایک حقیقی بھائی قیدی بن کر ایک انصاری مسلمان کے ہاتھ آتا ہے، سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ گزرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ رسیوں سے جکڑ رہا ہے۔ سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: "اس کو ذرا اچھی طرح کس کے باندھو، اس کی والدہ بڑی مالدار عورت ہے، جب اس کو پتہ چلے گا کہ میرا بیٹا بڑی تکلیف میں ہے تو وہ اس کو زیادہ پیسہ اور زیادہ فدیہ دے کر چھڑائے گی۔" سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کے بھائی نے یہ سن کر کہا کہ مصعب رضی اللہ عنہ! تم یہ کیا کہتے ہو؟ کیا میں آپ کا حقیقی بھائی نہیں؟ آپ کی ماں اور آپ کا والد میرے والدین نہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اس کو نصیحت کرتے کہ میرے اوپر آسانی کرے۔ آپ اس کو الٹا سختی کی نصیحت کر رہے ہیں!" تو سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کا جواب سنیے۔ فرمانے لگے کہ: اس وقت اگر میرا بھائی ہے تو یہ انصاری مسلمان ہے یہی میرا اسلام اور اخوت کا بھائی ہے۔

[سیرۃ ابن ہشام: ۲/۳۰۰، ۲۹۹]

میرے بھائیو! غزوہ بدر میں چشم فلک نے دیکھا کہ باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے اوپر تلوار چلا رہے ہیں۔ ایک مؤمن ہے اور دوسرا کافر ہے اور دونوں اس لیے ایک دوسرے کی گردن کو کاٹنے کے لئے تیار ہیں کہ ایک مؤمن ہے اور دوسرا کافر ہے۔ دونوں قریبی رشتہ دار اس لیے ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ یہ بات ہے: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی، لیکن افسوس یہ ہے کہ اب یہی بغض اور حسد جتنا ہمارا اپنے بھائیوں کے ساتھ ہے، اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے اور کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میں آپ کو کیا کہوں:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔ [آل عمران: ۳/۱۳۴]

"کہ یہ لوگ غصہ دبانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں"۔

یہ اور اس جیسی ساری کی ساری آیتیں ہمارے ہاں عملاً منسوخ ہو چکی ہیں۔ ہمارا سارا زور، دولت اور ساری صلاحیتیں اپنے ہی بھائیوں کو نیچا دکھانے اور اپنے ہی لوگوں کی گردنیں کاٹنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اپنے بھائیوں کو مجروح کرکے، عجیب وغریب الزامات، بہتان اور اُن پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کرکے، ہمیں خاص طور پر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں واحد دشمن ہی ہمارا ہم عقیدہ ہے۔ کوئی اور شاید نہیں ہوگا۔ یہ صورت حال ایسی ہے کہ جس نے ہماری جماعت کے افراد میں ایک نظم کو پیدا نہیں ہونے دیا، ایک منظم جماعت کو ہم پیدا نہیں کرسکے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آپس میں اتنی محبت اور تعلق ہوتا اور اتنی ہمدردی اور دلی کشادگی ہوتی کہ دوسروں کے لئے ہم ایک قوت بن جاتے اور اپنے ان لوگوں کے لئے ہم نرم دل ہوتے، کسی کی شدید اور غلیظ بات کو ہم قبول کر لیتے اور اس کو ہم معاف کر دیتے۔ ہمارے ایثار کی بات یہ ہوتی کہ ہم اپنا جائز حق بھی اپنے بھائی کو معاف کر دیتے، لیکن افسوس یہ ہوتا ہے جب شدت پیدا ہوتی ہے تو دوسرے ساتھی بھی اپنی آستینوں کو چڑھالیتے ہیں اور وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کا جواب دے کر رہیں گے اور ہماری پوری قوت جو دعوت کے کام میں لوگوں کو شرک سے نکالنے میں اور لوگوں کو بدعت اور جمہوریت کی زنجیریں توڑنے میں لگانی چاہیے تھی، وہ ساری کی ساری صلاحیتیں ایک دوسرے کے خلاف ضائع ہوتی ہیں۔ مگر دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا کام کرنے والے بھائی جو اپنے ہی بھائیوں کے روزانہ نت نئے الزامات کا شکار رہتے ہیں، انہیں اس آیت کو یاد رکھ کر صبر کرنا چاہیے کہ اللہ ذوالجلال فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ عُصۡبَۃٌ مِّنۡکُمۡ لَا تَحۡسَبُوۡہُ شَرًّا لَّکُمۡ بَلۡ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ۔

[النور: ۱۱/۲۴]

"تم نہ سمجھو کہ یہ الزامات اور تہمتیں تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے، تم ان کو اپنے لئے برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہیں"۔

دنیا میں بھی اللہ آپ کا دفاع کرے گا اور قیامت کے دن بھی، اور دین کے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے لوگوں کو سخت ترین عذاب ہوگا۔ میرے بھائیو، یہ ایک ضروری اصول ہے:

اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ کا، جو اس جماعت کے افراد اور دعوت دین کا کام کرنے والے داعیوں میں ہونا چاہیے۔

رھبان باللیل وفرسان بالنھار کا ماحول بنائیں:

اللہ ذوالجلال تقویٰ اختیار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا۔ [الفتح:۲۹/۴۸]

کہ یہ لوگ جو ایک امام کی قیادت میں اللہ کے دین کو غالب کرنے والے ہیں، یہ لوگ کیسے ہیں؟ آپ ان کو دیکھیں تو آپ کو رکوع اور سجدے کی حالت میں اللہ کی رضا اور خوشی تلاش کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ آپ قرآن کریم کا اسلوب دیکھیں!..... یہ نہیں کہا کہ اَقَامُ الصَّلٰوۃَ یہ نہیں کہا کہ {اِیْتَاءُ الزَّکٰوۃَ} یہاں ایک عجیب اسلوب اختیار کیا ہے۔ کیا آپ ان کو دیکھ رہے ہیں کہ یہ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں، یہ رکوع کئے ہوئے ہیں۔ یہ اسلوب صرف نمازوں کی پابندی کے اوپر ہی اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ نوافل اور دوسری نمازیں بھی اس میں آجاتی ہیں، تاکہ یہ مصداق سامنے آجائے۔ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہی یہ ہے کہ: رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ کہ رات کے وقت وہ مصلوں پر سوار اللہ کے سامنے رو رہے ہوتے ہیں، یہ تہجد پڑھتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں ہر حالت میں نماز کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جبکہ دن کے وقت وہ گھوڑوں کی پشتوں پر سوار ہو کر جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔

تو اس لیے میرے بھائیو! وہ کیسا آدمی ہوگا جس کو آپ موٴحد سمجھتے ہیں، موٴحد جماعت کا ایک فرد سمجھتے ہیں، لیکن وہ ہے بے نماز!!۔۔۔اور جب ہمارے کچھ بھائی رکن سازی کی مہم چلاتے ہیں تو اس میں یہ نہیں سوچتے کہ کوئی نماز پڑھتا ہے کہ نہیں پڑھتا۔۔۔ کوئی سود کھاتا ہے کہ نہیں۔۔۔اس کے گھر میں شرعی پردے کا انتظام ہے یا نہیں۔۔۔اس کے چہرے کے اوپر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے یا نہیں ہے۔۔۔اس کا چال چلن کیا ہے؟ لیکن یہ بھائی ہیں کہ سب سے فارم بھروائے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ رکن سازی ہو رہی ہے۔ جی ہماری مسجد میں اڑھائی سو آدمی ہیں، جو اس جماعت حقہ کے افراد (داعی) ہیں جن کے ذریعے اللہ نے اس دین کو غالب کرنا ہے۔ میرے بھائیو! یاد رکھو! ایسے افراد کو اکٹھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ ایسے افراد اپنے ساتھ ملائیں کہ جن کا تزکیہ ہو چکا ہو، وہ نماز کے پابند ہوں

رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ کی تصویر ہوں۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ کی مثال ہوں اور کتاب وسنت کے صحیح حامل ہوں، کہ دنیا کی کوئی طاقت نہ ان کو خرید سکے، نہ ان کے سروں کو نیچا کرسکے اور نہ دنیا کا کوئی لالچ ان کو ان کے مؤقف سے ہٹا سکے۔

ہمارے ہاں عجیب قسم کی تربیت ہے، عجیب قسم کا تزکیہ ہے، آپ نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ سنا ہوگا کہ غزوہ تبوک میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان کی سب سے عزیز ترین اور محبوب ترین ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جاتے ہیں تو جب وہ اپنے سب سے قریبی عزیز چچازاد ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں تو وہ انہیں السلام علیکم کا جواب ہی نہیں دیتے۔ اس کے رد عمل میں جب وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ: ''بھائی میری کوئی غلطی یا کوئی بات ہی بتا دو؟'' تو وہ جواب دیتے ہیں! اَللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ اَعۡلَمُ اللہ جانتا ہے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتا ہے۔'' کہتے ہیں۔'' مجھے ان کا بہت افسوس ہوا' میں پھر مایوس ہو کر واپس آگیا۔ مدینے کی گلیوں میں ایک آدمی کو دیکھتا ہوں کہ وہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ ''کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہاں ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''یہ جو آدمی آرہا ہے۔ یہی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہے دراصل آپ رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ یعنی غزوہ تبوک کے معرکے میں لڑنے سے رہ گئے تھے۔ اس آدمی نے آپ کو غسان کے بادشاہ کا ایک خط دیا۔ خط کو پڑھا، اس خط میں لکھا تھا'' اِنَّ صَاحِبَکَ قَدۡ جَفَاکَ'' ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ آپ کا صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔

وَلَمۡ یَجۡعَلۡکَ اللّٰہُ بِدَارِ ھَوَانٍ وَلَا مُضِیۡعَۃٍ فَالۡحَقۡ بِنَا نُوَاسِیۡکَ [متفق علیہ]

اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی ذلیل انسان نہیں بنایا ہے۔ آپ میں تو بڑی صلاحیتیں ہیں۔ آپ کی جماعت اور آپ کے لوگ تو آپ کی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کر رہے۔ دیکھیے یہ لالچ کیسا ہوتا ہے؟ ہمارا کوئی بھائی بہت بڑا عالم ہو، سمجھدار ہو، اس کو جماعت کا کوئی عہدہ نہیں ملتا یا وہ جیسا مقام چاہتا ہے اس کو کسی وجہ نہیں مل سکتا، دوسری جماعتیں آکر کھینچتی ہیں کہ آپ کے مقام اور مرتبے کے مطابق تو آپ کو جگہ ہی نہیں ملی، آپ تو اتنی اعلیٰ صلاحیتیوں کے مالک تھے، آپ کو کچھ بھی نہیں بنایا گیا، ہمارے پاس آجائیں، ہماری تنظیم یا جماعت میں شامل

ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے موٴحد کہلانے والے بھائی دیگر سیاسی جماعتوں میں اپنی خدمات صرف کر رہے ہیں جن کا نہ کوئی دین ہیں نہ کوئی عقیدہ ہے، نہ ان کا مذہب ہے اور وہ دین اسلام سے کوسوں دور ہیں۔ یہ بھائی ان جماعتوں میں صرف اس لیے کام کرنے چلے گئے کہ ہمارے اندر تو بڑی اعلیٰ صلاحیتیں تھیں، ہم کوئی ذلیل تو نہیں تھے، اب یہ وہ اسٹیج ہے کہ جہاں ہم کام کریں گے۔

میرے بھائیو!.....شاہِ غسان کے خط میں یہی تو لکھا تھا کہ آپ کوئی کم مرتبے کے آدمی تو نہیں ہیں کہ آپ کو نظر انداز کر دیا جائے۔آپ ہمارے پاس آجائیں، ہم آپ کی دلجوئی اور قدر کریں گے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جن کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت کی تھی، جو صرف کتاب وسنت کے حامل ہی نہیں تھے بلکہ ان کا تزکیہ ہو چکا تھا اور "تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُوْنَ ۔۔الخ" کی صحیح مثال نظر آتے تھے۔ انہوں نے کیا جواب دیا؟..... سنیں! کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس خط کو پکڑا اور دینی حمیت وغیرت کے جذبے کے تحت جلتے ہوئے تنور میں پھینک دیا۔۔۔اور اس حال میں زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ آپ کی وزارتیں آپ کی لالچ، یہ دنیا کی حکومتیں، میں جوتے کی نوک پر ٹھکرا دیتا ہوں، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور رفاقت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

میرے بھائی!..... جب تک ہماری جماعت کے افراد ایسے کردار کے مالک نہیں بنیں گے، وہ اپنے موقف پر اس قدر مضبوط اور ٹھوس قائم نہیں ہوں گے کہ ان کو کتنی بھی پریشانیاں آئیں کتنی ہی مشکلات آئیں، جب تک وہ اپنے ایمان اور عقیدے کو سامنے رکھ کر ثابت قدمی سے جمیں گے نہیں۔ اتنی دیر تک یہ اللہ کے دین کو کیسے غالب کر سکتے ہیں! يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا یہ صفت ہے ان لوگوں کی جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں۔ میرے بھائیو!..... یہ صفت بڑی اہم ہے بلکہ آپ یہ سمجھیں کہ پورے کے پورے دین کا دارومدار اس صفت کے اوپر ہے يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا کہ جو لوگ دعوت دین کا کام کرتے ہیں، دین اسلام کو قائم کرنے کے لئے کام کرتے ہیں، اپنی جان اور مال پیش کرتے ہیں، ان کے سامنے صرف اور صرف اگر کوئی مقصود و مطلوب ہوتا ہے، تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی

رضامندی ہوتی ہے، اپنی شہرت ونمود یا ریاکاری نہیں ہوتی۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کسی شخص نے مسجد بنائی اور اس نے اس کے اوپر لکھ دیا کہ فلاں صاحب مسجد کے تعمیر کرنے والے ہیں۔ فَقَدْ اَبْطَلَ عَمَلَه اس نے اپنے عمل کو برباد کر لیا۔ اس لیے کہ اس کا یہ کام يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اپنے نام اپنی شہرت کے لئے تھا، اور یہ شہرت اس کو دنیا میں مل گئی، آخرت میں اسے اپنے عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے بھائیو!..... علماء کرام، طلباء کرام اور دوسرے جو سخی اور مالدار حضرات ہیں، سب بھائی اس حدیث کو سامنے رکھیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"سب سے پہلے وہ تین آدمی جن کو اللہ جہنم کی آگ میں پھینکے گا اور جہنم کی آگ میں جلائے گا یعنی ان کے ذریعے جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ ان میں سب سے پہلا قرآن کریم کا قاری اور عالم ہوگا، دوسرا سخی اور تیسرا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا مجاہد ہوگا"۔ [مسلم: کتاب الامارۃ]

حالانکہ ان کے یہ سارے اعمال اچھے ہیں لیکن ان اعمال کے اندر يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا نہیں تھا۔ ایک نے اپنی شہرت کے لئے جہاد کیا تھا کہ میں بڑا بہادر کہلایا جاؤں گا، دوسرے نے اپنے آپ کو سخی کہلوانے کیلئے اپنا نام لکھوایا تھا کہ یہ حاجی صاحب اس مسجد کو تعمیر کرنے والے ہیں۔ تیسرے نے اپنے آپ کو بڑا عالم اور بڑا قاری (وداعی و مبلغ) کہلوانے کے لئے لوگوں کو قرآن مجید سنایا تھا۔ میرے بھائیو!.....يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا ایسی صفت ہے جو ہر وقت ہمیں اپنے سامنے رکھنی چاہیے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ تھوڑا سا جماعت کے اندر کام کر لیا تو پھر ہمارے لئے مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، ہم فوراً کریڈٹ کیلئے مغموم ہو جاتے ہیں، کہ ہم نے دس سال کام کیا آٹھ سال کام کیا، اتنی محنت کی ہے، ہمیں کیا کریڈٹ ملا؟ ہمارے اخلاص کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی عالم کو ایک مسجد سے یا مدرسے سے جواب ملتا ہے تو اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ مسجد بھی اُجڑ جائے، یہ مدرسہ بھی برباد ہو جائے، جب تک میں اس مسجد میں ہوں یا مدرسے میں ہوں، اس میں کام ہوتے رہیں، میری شہرت ہوتی رہے، جب میں یہاں سے نکل جاؤں تو ایک بھی لڑکا (طالب علم) اس میں نہ رہے، دعوت دین کا کام رک جائے، یہاں سے داعی نکلنے بند ہو جائیں۔

میرے بھائیو! ...... یہ يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا } کا کام نہیں ہے۔آپ اس بات پر اچھی طرح غور کرلیں اور اس کو سمجھ لیں کہ ایسے قیمتی افراد کیسے پیدا ہوتے ہیں؟۔۔ ہمیں آج جو اپنی حالت نظر آرہی ہے، یا اپنی جماعت کی حالت نظر آرہی ہے، یا اپنے افراد کی حالت نظر آرہی ہے، یہ تو ہمیں ایسی نظر آتی ہے کہ یہ صفات بالکل الٹ ان میں پائی جاتی ہیں۔

نعروں کی سیاست سے اجتناب کریں اور دعوت دین کا کام کریں:

ایک بات اور قابل غور ہے کہ ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے نعروں کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کو جلسوں اور کانفرنسوں پر اکٹھا کر کے آپ ایسی جماعت تیار نہیں کر سکتے۔آپ ایک یا چار سال کے اندر ایسی جماعت کو تیار نہیں کر سکتے بلکہ

كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔
[الفتح:۲۹/۴۸]

جس طرح انگوری اُگتی ہے، وہ بالکل کمزور ہوتی ہے، پھر وہ ذرا مضبوط ہوتی ہے، وہ تنا پکڑ لیتی ہے، پھر اس کی شاخیں نکلتی ہیں، پھر اس کو پھل لگتا ہے کیا یہ سارا کام اچانک ہو جاتا ہے؟ صرف نعروں سے ہو جائے گا، ایک جلسے سے سارا کام ہو جائے گا۔ ایک جلوس نکالنے سے یہ سارے کے سارے مرحلے طے ہو جائیں گے؟؟ نہیں، ہرگز نہیں! اس کے لئے تو ایک طویل وقت درکار ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں امارت اسلامی کا کام، اقامت دین کا کام، حکومت الٰہیہ کے قیام کا کام، یا الہ واحد کے دین کو غالب کرنے کا کام دعوت الی اللہ کا کام محض نعروں سے کر سکتا ہوں، چھ سال میں کر سکتا ہوں۔۔۔ وہ شخص بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے، بلکہ آپ دوسری جگہ پر آئیں تو اللہ ذوالجلال نے اسلام کی مثال کھجور کے درخت کے ساتھ دی ہے اور صحیح بخاری کے اندر ایک حدیث ہے اس میں ایک مؤمن کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھجور کے ساتھ دی ہے آخر اس کی حکمت کیا ہے؟ اس میں بڑی حکمتیں اور کئی مشابہتیں ہیں، آپس میں کئی مناسبتیں ہیں۔

پہلے بیج بویا جاتا ہے، پھر پتے نکلتے ہیں۔۔۔ الغرض یہ سارے کے سارے مرحلے طے کر کے آٹھ یا دس سال کے بعد آپ اس کا پھل لے سکتے ہیں۔

میرے بھائیو! اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت کو تیار کریں جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کام کرے تو ہمیں چاہئے کہ ہم یہ اصول سامنے رکھیں، یہ طریقہ اختیار کریں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ اور پھر اس جماعت کے دو کام ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کے دین کی دعوت دینا۔ جب ہم دعوت میں نکلیں گے، اللہ کے دین کی دعوت کا کام کریں گے تو پھر ٹکراؤ پیدا ہوگا۔ ایسی اکڑی ہوئی گردنیں نظر آئیں گی جو لوگوں کے سامنے خالص توحید کو پہنچانے سے روکیں گی۔ اکڑے ہوئے ہاتھ نظر آئیں گے جو اللہ کے کلمے کو آگے نہیں پہنچانے دیں گے۔ تو ان ہاتھوں کا کاٹ دینا ان اکڑی ہوئی گردنوں کو کاٹ دینا، یہ وہ ہے جس کو آپ جہاد (قتال) کہتے ہیں..... یہ دعوت کا کام نہایت مشکل ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا کام ہے، جو ہماری تقریروں اور ہماری تدریس سے بھی مشکل کام ہے۔ ہماری تبلیغ کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ جب کہیں جلسہ کیا، کہیں تقریر کرنے گئے، تو اگر کہیں کسی قسم کی مخالفت کا خدشہ ہو تو پہلے ہی مسلح ہو کر جاتے ہیں تاکہ اگر کہیں معمولی مخالفت یا پریشانی اور تکلیف کا سامنا ہو بھی جائے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر آئیں۔

میرے بھائیو!..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دینے کے لئے جارہے ہیں تو پھولوں کی بارش نہیں ہوتی تھی! ہمارے اوپر تو پھولوں کی بارشیں ہوتی ہیں، تقریر سے پہلے ہزاروں من پھول اوپر گرتے ہیں، تقریر کرنے سے پہلے ہماری شان میں کتنی دیر تک نعرے اور القابات بلند ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مبلغ "توحید" بیان کرنے جارہا ہے اور اُوپر سے پھولوں کی بارشیں ہوتی ہیں! لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت دینے اور اللہ کا قرآن سنانے کے لئے جاتے ہیں تو اوپر سے پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔۔۔ اور پھر جواباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ردعمل نہیں کرتے کہ اب تو ہم زخمی ہو گئے، اب تو ہم مجروح ہو گئے، نہیں! یہ ساری تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور زبان نبوت سے فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ [بخاری: کتاب احادیث الانبیاء]

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ لوگ تو جانتے نہیں، ان لوگوں کو تو پتہ ہی نہیں ہے۔"

جب ہمیں زخم آئیں گے، ہمیں تکلیفیں پہنچیں گی، تو ثابت قدم رہنے والے اور عزم و استقلال والے لوگ پھر پیدا ہوں گے۔ جب ہم دعوت کے میدان میں دعوت کا کام کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی جان کو مصیبت میں ڈالیں گے اور پھر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے جب موقع آجائے تو ہم تلوار کو بھی ہاتھ میں اٹھائیں گے، تو ان مرحلوں کے بعد دو ہی صورتیں سامنے آئیں گی:

۱: یا تو آپ اللہ کی راہ میں شہادت کے لئے اس طرح قبول کر لئے جائیں گے کہ:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ [الفجر:۸۹/۲۷تا۳۰]

کا سرٹیفکیٹ تھما کر آپ کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

۲: دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کوشش کے نتیجے میں اللہ ذوالجلال اس دنیا پہ اپنے کلمے کو بلند کر دیں گے اور امارت اسلامی کا قیام وجود میں آجائے..... انشاء اللہ

ایک جماعت کے تحت رہیں اور امیر کی اطاعت کریں:

میرے بھائیو!..... یہ سارا کام موٴحدین کا ہے، جن کے پاس دین ہے۔ جن لوگوں کے پاس دین ہی نہیں ہے آپ ان سے یہ توقع کریں اور یہ امیدیں رکھیں کہ یہ لوگ اللہ کے دین کا نفاذ کریں گے، یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ اسلاف کے طریقہ کار کو اپنانے والوں کا کام ہے، اہل توحید کا کام ہے، یہ انصار السنۃ کا کام ہے، ہم اپنے اندر اخلاق پیدا کریں، اپنا تزکیہ کریں، اپنی زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق بنائیں اور ایک جماعتی نظم کے اندر آجائیں۔ دیکھئے اکیلے اکیلے رہ کر کام نہیں ہوتا۔ امارت کا نظم ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاَمَارَةٍ وَلَا اَمَارَةَ اِلَّا بِاِطَاعَةٍ [سنن دارمی:۱/۲۹]

کہ جماعت کا وجود امیر کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور امارت بغیر تابعداری کے ممکن نہیں۔

تو جماعت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک امیر ہو اور وہ امیر اس جماعت کو چلائے۔ وہ باصلاحیت آدمی ہو، اس کی دینی خدمات ہوں، وہ جانتا ہو کہ کتاب وسنت کیا ہے؟ اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کیلئے مجھے کیا کیا کام کرنے ہیں۔ جہاد بھی کرنا ہے، دعوت بھی دینی

ہے (اور دعوت دین کے کام کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے) اور اس پوری جماعت کو کتاب وسنت کے مطابق چلانا بھی ہے۔ ہم یہ بحثیں کر رہے ہیں کہ یہ نظام کیسے چلے گا؟ تو بھئی اللہ کے فضل سے سب باتیں ہم پر واضح ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم اخلاص نیت سے عمل کی ابتداء کر دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو سامنے رکھ کر اپنی زندگیوں کو بدل دیں۔ تب ہی ہم سب جھگڑوں سے نجات پا سکیں گے اور ہم ایک مثالی جماعت بن کر دنیا پر کلمۃ اللہ کو سربلند کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

باب:۶

دعوت کی ناکامی کے اسباب اور ان کا حل

کوئی بھی شخص جو اس مختصر تحریر سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کتاب کو سنجیدگی و متانت سے مطالعہ کرے تاکہ اس کی روح ہماری روح سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اور اس کا دل اپنے ان تمام داعی بھائیوں سے جڑا رہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں دعوت دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ بات صرف پڑھنے کی حد تک نہ رہ جائے بلکہ جو کچھ پڑھے اس کے مطابق عمل کرنے کا عزم بھی رکھتا ہو۔

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اصل مقصود فی الواقع کلام نہیں ہے اور ہم بھی اور لوگوں کی طرح ۔۔۔خواہ مخواہ کی طویل بحثوں کو بیکار ہی سمجھتے ہیں اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ملت کے اوپر ایک طویل زمانہ گزرا ہے جس میں صرف بحثیں ہوتی رہیں، اور اب یہ ملت بحثوں سے اکتا چکی ہے، اس لیے اب علمی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے، مگر چونکہ کوئی بات پیش کرنے کے لئے افہام و تفہیم ضروری ہے اور بغیر اس کے ہم اپنی دعوت کو دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے، اس لیے یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نبی یا صاحب فکر ایسا نہیں گزرا ہے جس نے تحریر و تقریر سے اپنی دعوت کا آغاز نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اسے قبول کیا اور اس کی پیروی کو اپنا شعار بنایا اور اس کی تبلیغ واشاعت پر اپنی تمام تر جدوجہد صرف کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کش تہذیب جو آج کل ذہنوں پر چھا چکی ہے اور جس کا بیشتر سرمایہ ہمارے دشمنوں کے کیمپ سے درآمد کردہ ہے، اس کا استیصال اور اس کی بالکلیہ اصلاح نہایت ضروری ہے۔ ہم اکثر وبیشتر اپنے دین، عقیدہ، وطن اور تہذیبی وراثت کے سلسلے میں مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس پر خاموش رہنا ہم سب کے لئے نہایت مہلک ہے۔ اس غیر اسلامی تہذیب کے بعض مندرجہ ذیل نمایاں اثرات

ہمارے سامنے ہیں:

☆ نشاۃ ثانیہ خاص طور سے دینی بیداری کی طرف سے عمومی مایوسی پیدا ہو چکی ہے۔

☆ غفلت ولاپرواہی اور خالق سے بیزاری عام ہو چکی ہے۔

☆ پوری امت عیش کوشی وتن آسانی میں غرق ہو چکی ہے اور غیروں سے مرعوب اور ان کی تہذیب وثقافت کی دلدادہ ہے۔

☆ دنیوی معاملات میں گروہ بندی اور افتراق کی دراڑیں پڑ چکی ہیں اور اس چیز نے ہماری کمزوری اور درماندگی کو دوچند کر دیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ داعیان اسلام مقلد جامد بن کر رہ گئے ہیں۔ نئی راہیں نکالنا اور نئے طریقوں سے دعوت کا کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ فریضہ دعوت کو اس طرح انجام دیتے ہیں کہ یہ ان فرائض کا ایک جز ہے جو مسلمان پر ڈالے گئے ہیں اور جن کے ذریعہ وہ دنیا کی کامیابی کے بجائے صرف آخرت کے ثواب ہی کی توقع رکھتے ہیں۔ اور اس کی خاطر ہر مشکل کو آسان ہر قربانی کو محبوب خاطر اور ہر دور دراز مسافت کو اپنی آرزوؤں کے حصول میں قریب تر سمجھتے ہیں اور دنیا میں غلبۂ دین کی انہیں کوئی تڑپ نہیں ہوتی۔

اس لیے اگر کجی اور بے راہ روی کو درست کرنا ہے۔ اسرار دین کی نقاب کشائی کرنی ہے، دین کے احکام جو مٹ چکے ہیں انہیں از سر نو زندہ کرنا ہے اور امت کے اندر فکری بیداری پیدا کرنی ہے تو علی الاعلان دعوت دین کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔

دعوت کی ناکامی کے اسباب:

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مدت ہائے دراز سے داعیان حق غلط مروجات کو بدلنے، دین کی عظمت کی بازیابی اور لوگوں کو اس کی خیر وبرکت سے ہمکنار کرنے میں کوئی موثر اور قابل ذکر رول ادا نہیں کر سکے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کے درج ذیل اسباب ہیں:

ا۔ اقتدار سے محرومی:

داعی صرف تقریر و تحریر کے ہو کر رہ گئے ہیں اور اگر انہوں نے تربیت کی طرف کچھ

توجہ بھی کی تو نہایت محدود پیمانے پر.....اس کی وجہ یا تو وسائل وذرائع کی کمی ہو، یا پھر عوامی تائید کا فقدان رہا ہو، یا کہ وہ ایسے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے جس کے کھینچنے والے دشمنان اسلام تھے.....اس سے پہلے ہم پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب وعظ کہنے والا قوم کا سردار یا قاضی ہوا کرتا تھا اور حکومت وقت اس کی کفالت کرتی تھی۔ لیکن آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید وہ شخص اپنے آپ کو نہایت خوش بخت تصور کرے اگر وہ سلطنت کی آزمائشوں سے بچ کر نکل جائے۔

۲۔ علم کی ناقدری:

جب مادیت کا سیلاب پوری طرح سے امڈ آیا اور لوگ اپنے دین سے بے فکر ہو کر اپنی دنیا بنانے میں مصروف ہو گئے تو وہ علماء کو بالکل ہی بھول گئے اور بیچارے علماء احساس کمتری کا شکار ہو گئے، اور ان میں سے اکثر خود اپنے اور دوسروں کے اوپر بوجھ بن کر رہ گئے اور ان کو ہر طرح توہین وتذلیل کا نشانہ بنایا گیا حتی کہ قصہ کہانیوں میں بھی ان کا نام (تضحیک وتذلیل کے لئے) لیا جانے لگا اور اس طرح وہ عوام میں بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے اور اب حکومت کے وسائل وذرائع ان کو فقر وفاقہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کی تنقیدوں سے بچ سکیں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ عوام خود ان کی مدافعت کرتے تھے مگر انہوں نے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

۳۔ داعیان دین کی غلطیاں:

داعیان کرام کی اکثریت نے بعد کی صدیوں میں ان گھسے پٹے طریقوں اور اسالیب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جن سے عوام مذہب سے مزید دور ہو گئے۔ پھر ان کے اندر فکر کی بلندی بھی نہ تھی اور انہوں نے اس طرح سے دین کو لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ یہ نئی اور سرکش نسل اس کی متحمل نہ ہو سکی اور دین سے اس کی نفرت بڑھتی ہی گئی۔ جبکہ آج معاشرہ میں لہو ولعب عام ہو چکا ہے اور نوجوانوں کو تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا دینے کے لئے بہت سے ذرائع موجود ہیں۔ سہولت پسندی اور زینت وآرائش کے دوسرے سامان بغیر کسی خاص کوشش اور محنت کے ہر جگہ دستیاب ہو رہے ہیں، اس کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے

کہ بعض علماء نے اللہ کے فضل سے معاشرے میں اپنے کافی گہرے اثرات چھوڑے اور معاشرے میں قابل ذکر اصلاحات کیں، لیکن ایسے اصحاب خال خال ہی گزرے ہیں، ان کی مثال بجلی کی کوند کے مانند تھی، جو ایک آن میں چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا:

لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَى الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ۔

[مسلم، کتاب الامارۃ]

"ہمیشہ ہماری امت میں ایک ایسا گروہ موجود رہے گا جو صحیح دین پر قائم رہے گا مخالفین کی مخالفتیں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی تاآنکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔"

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم دوسرے صالحین کے تعمیری کارناموں کا انکار کرتے ہیں یا ان حامل توحید باعمل علماء کی خدمات کو فراموش کر رہے ہیں جو انہوں نے مختلف میدانوں میں انجام دی ہیں فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَیْرَالْجَزَآءِ بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اسلام کا کام کرنے کے لئے ایک نئی نسل ابھرے جو ٹھوس علمی حقائق کو اپنا کر دعوت اسلام کی نشرو اشاعت کا کام انجام دے اور اس سے اس کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہو تاکہ اس کے ذریعے سے وہ دین کو سربلند کر سکے اور اس سرزمین پر کوئی فتنہ باقی نہ رہ جائے اور ساری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہو جائیں۔

واضح رہے کہ یہاں اس کتاب میں دین کے اسرار ورموز نہیں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ اللہ کے فضل سے اس میدان میں اب تک کافی کام ہو چکا ہے، بلکہ یہاں صرف اس قدر بتانا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کرے کہ اس سے بہترین نتیجہ برآمد ہو سکے۔

کامیابی کی شرائط :

دین الٰہی ..... جس کی آخری شکل آج اسلام کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے اور جسے لے کر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں آئے تھے۔ روئے زمین پر وہ محض اس وجہ سے غالب نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے، یا یہ کہ ہم نے اسے ٹھیک ٹھیک لوگوں تک پہنچا دیا ہے یا یہ کہ اسے اللہ تعالیٰ جبراً نافذ کر دے جیسا کہ کائنات کے طبعی

قوانین اس نے بنائے ہیں۔مذکورہ بالا کوئی شکل بھی اختیار کرنے سے دین قائم نہیں ہو سکتا ...بلکہ اس کا نفاذ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسانوں ہی کی ایک جماعت اس کو قائم کرنے کا بیڑا اٹھائے۔

جو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتا ہو اور بقدر استطاعت اس پر ثابت قدم ہو، جو (اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر) دوسروں کے دل ودماغ اور ان کی زندگیوں میں اسے نافذ کرنے کے لئے کوشاں ہو۔رب ذوالجلال والاکرام کے اس قول کی پوری مصداق ہو:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ [آل عمران: ۱۰۴/۳]

"تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے، جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکتی رہے، اور یقینا ایسے لوگ ہی فلاح پائیں گے"۔

پھر اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس مقصد کے حصول میں فنا ہو جائے۔نیز انسانی کمزوریوں اور نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد میں مصروف ہو جائے، پھر ان سب سے برسر پیکار ہو جائے جو اپنے مفادات اور خواہشات نفس کی بنا پر دعوت کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے ہیں۔اور اس مقصد کے حصول کے لئے اس حد تک کوشاں ہو جائے کہ جتنا انسان کے بس میں ہے...اور جس قدر وسائل وذرائع اسے میسر ہوں انہیں اس راہ میں جھونک دے اور وہ اپنی دعوت کا آغاز اس نقطہ سے کرے جو عملاً ان کے لئے مفید ہو اور ان کی ضرورتوں اور زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہ ہو، تاکہ یہ دعوت فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔

اس طرح یہ جماعت کبھی فتح وکامرانی سے ہمکنار ہوتی ہے اور کبھی کبھی اسے شکست کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔اور اس کا دار ومدار اس کے اختیار کئے ہوئے ذرائع اور اس کی صرف کی ہوئی کوششوں پر ہوتا ہے اور اس کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ وہ اپنی سیرت وکردار اور معاملات میں کس حد تک ان ہدایات کی نمائندگی کرتی ہے۔اس طرح اس دعوت کی کامیابی، فن اور حکمت کے کارناموں، جہاد اور قربانی کی برکتوں اور اجتماعی کوششوں کی مقدار پر منحصر ہے۔

کامیابی کی کلید:

بعض حکماء کا خیال ہے کہ معاشرہ کی موجودہ صورت حال کی بہترین عکاسی کوئی مشکل چیز نہیں بلکہ کمال اس بات میں ہے کہ انہیں بہترین رخ دے دیا جائے حالانکہ اصل کمال تو یہ ہے کہ ان کے مستقبل کو حال سے زیادہ روشن وتابناک کرنے کی کوشش کی جائے...پھر ہم جس تحریک کے داعی ہیں وہ تعمیر وترقی کے صحت مند اصولوں پر قائم ہے،لوگوں کو ذاتی اصلاح کی ترغیب دیتی ہے، تنقید اور مسلسل احتساب کے ذریعے ان کی تشکیل سیرت کرتی ہے،اور برائیوں کے خلاف جہاد پیہم کی دعوت دیتی ہے،اس طرح اصلاح وتربیت کی بنیاد انسان کے اندرون کی تبدیلی ہے اوراس کے ذریعے سے معاشرہ میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے،اوراس کے نتیجے میں تاریخ ایک نیاانقلاب آفریں موڑ لیتی ہے۔

مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں کہ وہ بس حق کو جان لے اور نہ ہی یہ ہے کہ حق کی حمایت میں ساحل پر کھڑا ہو کر طوفان کی موجوں کا تماشہ دیکھے، جیسا کہ اشراقیوں اور صوفیہ کا ایک گروہ کرتا ہے۔بلکہ اس کا ہمیشہ سے یہی مطالبہ رہا ہے کہ دلائل سے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے اوراس سلسلے میں حکمت، فراخدلی، عالی ظرفی، روشن فکر اور دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی جیسے رہنمااصولوں کو اختیار کیا جائے۔

دعوت کو پیش کرنے کا یہی مناسب طریقہ ہے جو فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ سال تک صبر وثابت قدمی کو اپنا شعار بنائے رکھااور سرکش طبیعتوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہے اوراس بات کی قطعی پرواہ نہ کی کہ اس کے اثرات کب ظاہر ہوں گے۔جناب نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک لوگوں کو بندگی رب کا پیغام پہنچاتے رہے،اسی طرح جناب ابراہیم علیہ السلام کی مسلسل پیہم کوششوں کے بعد صرف لوط علیہ السلام ایمان لائے اور کتنے ہی انبیاء تواس طرح دعوت دیتے دیتے دنیا سے رخصت ہو گئےاور کوئی بھی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہ ہوا،تواس سے اس کی قدر ومنزلت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے اپنی وسعت کے مطابق اپنے فرائض کو انجام دیا...اس لیے دعوت کاکام کرنے والوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ پہلے اپنی نیت خالص کرلیں اور اس کے بعد صبر

جمیل کے ساتھ مسلسل دعوت کا کام کرتے جائیں اور ہر چیز سے پہلے ان کا اولین ہدف نفوس انسانی کی تطہیر ہو۔

دعوت کا انداز :

- دعوت کا مناظرانہ انداز خواہ وہ موثر دلائل سے بھرپور ہی کیوں نہ ہوں مخاطب کو قبول حق سے روک دیتا ہے،اس لیے مخاطب سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنی چاہئے کیونکہ اہم یہ نہیں ہے کہ آپ نے اسے بحث میں چھپ کر دیا ہے بلکہ کمال یہ ہے کہ آپ نے اپنی حکمت عملی سے اس کا دل جیت لیا ہے۔
- آپ کی ایک متعین منزل ہے جہاں تک آپ کو پہنچنا ہے،اس کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جو منزل تک جلد پہنچانے والا اور یقینی ہو۔ کیونکہ بعض کلمات اتنے جامع اور مختصر ہوتے ہیں،جو دوسرے طویل کلمات سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔
- ہر معاشرے کا اپنا ایک معیار ہوتا ہے جسے دعوت کے وسیع تر مفاد کے لئے اپنانا ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوف الٰہی کو تمام چیزوں پر اولیت حاصل ہونی چاہیے۔
- کسی بات کا فوراً جواب دے دینا یا تلخ وترش انداز میں کسی پر تنقید کر دینا...یہ جاہلوں کی تعلیم وتربیت کے لئے مفید نہیں بلکہ ضروری ہے کہ انہیں الوہیت اور نبوت کے بنیادی حقائق اور ان کی خصوصیات سے روشناس کرایا جائے۔اس سلسلے میں درج ذیل امور سے بالکلیہ پرہیز کیا جائے جو انسانی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتے ہیں۔
- چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد نہ بنایا جائے، یا کسی معاملے میں بالکل لاحاصل سی بحثوں سے پرہیز کیا جائے۔
- ضعیف روایات پر اعتماد نہ کیا جائے۔
- کسی متعین چیز پر اصرار بے جا نہ کیا جائے۔اور نہ موضوع بحث سے ہٹ کر ایسی باتوں کو چھیڑا جائے جن سے عوام متنفر ہو جائیں۔
- اللہ کی سنت ہے کہ زندگی بصیرت رکھنے والوں کو ملتی ہے اندھوں کو نہیں۔

- جو لوگ مال و دولت سے نوازے گئے ہیں اور وہ اصلاح و تعمیر میں موئثر رول بھی ادا کر سکتے ہیں، بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ وعظ و نصیحت کی محفلوں میں شریک ہوں اور اللہ کے گھر کو آباد کریں۔اسی بنا پر حرکت اور جدوجہد داعیان دین کے ناگزیر فرائض میں شامل ہے،اس لیے جو لوگ آپ کے پاس نہ آئیں انہیں ملامت نہ کیجیے بلکہ قابل ملامت تو آپ ہیں کہ ان سے رابطہ قائم نہ کر سکے۔
- نشہ کی کئی قسمیں ہیں اور سب سے بڑا نشہ نفس پرستی اور بے جا پندار ہے۔
- پیوند لگے ہوئے کپڑوں سے سید عمر رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہ آیا لیکن حریر و دیباج کے زرق برق کپڑے رستم کو شکست سے نہ بچا سکے۔
- داعی کی یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر وہ یہ سمجھ لے کہ اس نے کوئی تقریر کر کے یا اپنی کسی رائے کا اظہار کر کے عوام کے فکر و خیال کو بدل دیا ہے۔
- دعوت کی مقبولیت کے مختلف عوامل ہیں۔جس میں اہم ترین یہ ہیں:

(۱) اللہ کریم کی مخلوق سے محبت کی جائے (۲) وقت کو قربان کیا جائے (۳) اور ذاتی مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے... یہیں سے توفیق ایزدی بھی ملتی ہے۔

اہم یہ نہیں ہے کہ علمی اعتبار سے آپ بہت آگے ہیں بلکہ خاص بات یہ ہے کہ آپ کے اندر اصلاح کا جذبہ کس قدر ہے۔اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کو برحق سمجھتے ہوئے بھی لوگ آپ کی بات تسلیم نہیں کرتے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتّٰى حِيْنٍ۔ [یوسف: ۱۲/ ۳۵]

"پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لئے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاک دامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے"۔

اپنے مخاطب کو ہمیشہ ذہین اور عالم تصور کیجیے۔آپ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس پر گرفت کی جاسکے اور نہ دوسروں کو حقائق سے روشناس کرانے میں طویل بحثوں سے پریشان کر دیں۔

دوسروں کے عیوب اور ان کی خرابیوں کو اپنی تقریر کا مواد نہ بنائیں، یہاں تک کہ

کوئی سخت ضرورت پیش آجائے اور اس کے بغیر مخاطب کو بات سمجھائی نہ جاسکے اور اپنی تقریروں میں واقعات اور کہانیوں کو اتنی ہی مقدار میں بیان کیجیے، جتنی مقدار کھانے میں مصالحہ جات کی ہوتی ہے۔ لوگ آپ کے سلسلے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ آپ ہی "دعوت" ہیں تو ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے اس حسن ظن کو کسی معاملہ میں ٹھیس پہنچ جائے، اس لیے قول و عمل کے تضاد سے بالکلیہ پرہیز کیجیے۔ داعی کی حیثیت انجینئر اور معمار کی ہوتی ہے۔ وہ کوئی ایکٹر اور فنکار نہیں ہے کہ سٹیج پر عوام کو خوش کرتا پھرے۔ جس طرح کوئی فنکار محض لوگوں کی تسلی کی چیزیں پیش کرنا اپنا مقصد بناتا ہے۔

وہ معاشرہ جہاں کہ دعوت سے لوگ بالکل بدک رہے ہوں وہاں بڑی مہارت سے اس کو انجام دینا پڑتا ہے جس طرح سے پسماندہ ممالک کو ترقی پذیر بنانے میں سخت ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دین کے بس ایک پہلو کو پیش کرنے سے پرہیز کیا جائے مبادا اس کے دوسرے پہلو اوجھل رہ جائیں کیونکہ دین ایک مکمل دستور زندگی ہے۔

ماضی کی تحریکات پر نظر رکھے بغیر کوئی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جان لیجیے کہ زندگی ماضی، حال، مستقبل سے عبارت ہے۔ ثابت شدہ اور متفقہ امور میں دخل نہ دیجیے۔ جتنی اہم باتیں آپ کو کہنی ہیں ان کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے مرتب کرکے پیش کیجیے۔ جو کچھ آپ جانتے ہوں ضروری نہیں کہ کہہ ہی ڈالیں۔ ہر بات کو پیش کرنے کا ایک موقع ہوتا ہے۔

لوگوں کو وہی باتیں بتایئے جن کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہو۔ محض خیال آرائی سے بات نہیں بنتی.....الفاظ کو بولنے سے قبل تول لینا چاہیے، کیونکہ غلطیاں ہی یاد رکھی جاتی ہیں اور اچھائیاں لوگ بھلا دیتے ہیں۔ دعوت کامیابی سے اسی وقت ہمکنار ہو سکتی ہے جبکہ نفس موضوع کی صحت کے ساتھ اس کے پیش کرنے کا انداز بھی درست ہو۔ اگر آپ کسی کو نصیحت کرتے ہوئے یہ کہیں کہ "جھگڑا مت کیا کرو" تو وہ آپ کی اس بات کو عقلی طور سے تو مان لے گا لیکن جذبات میں آکر وہ آپ کو بھی ٹھکرا دے گا اور آپ کی بات کو بھی، اس لیے کہ آپ نے اسے لوگوں کے سامنے پشیمان کیا ہے حالانکہ ایسی باتیں تنہائی میں کہنے کی ہوتی ہیں۔

لوگوں کے مراتب ان کے عہدوں اور اجتماعی مناصب کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ یہی

پیمانہ آج کل رائج ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ایسا شخص بھی عہدہ پر پہنچ جاتا ہے جو اس کے لئے بالکل نااہل ہوتا ہے اور معاشرے میں نمایاں مقام وہ شخص بھی حاصل کر لیتا ہے جو اس کے لئے غلط طریقہ اختیار کرتا ہے۔ صحیح پیمانہ دل کی نرمی، عقل کی سلامتی اور اللہ کے لئے مخلوق پر ترس کھانا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ [حجرات:۴۹/۱۳]

" درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

باب:۷

انفرادی دعوت

مفہوم:

انفرادی دعوت میں گفتگو کسی ایک فرد یا چند افراد سے ہوتی ہے۔ اس میں کسی اکثریت کو خطاب نہیں کیا جاتا، اور تو اور بسا اوقات یہ پہلے سے بغیر کسی طے شدہ پلان ہی کے تحت انجام پاتی ہے، مثلاً اتفاقی ملاقاتوں میں، مجلسی گفتگوؤں یا دوستوں کی نشستوں میں انفرادی طور سے اس کے مواقع ملتے ہیں۔

خصوصیات:

اس طرز کی دعوت اپنے اندر مختلف قسم کی خصوصیات رکھتی ہے جن میں مندرجہ ذیل نہایت واضح ہیں:

الف۔ یہ بار بار پیش آنے والی چیز ہے اور ہر شخص کو روزانہ کئی کئی مرتبہ اس کا موقع ملتا ہے۔

ب۔ اس میں کسی محنت وکاوش کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اکثر تو یہ دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ہی ہو جایا کرتی ہے اس لیے اس میں کوئی خاص وقت بھی صرف نہیں ہوتا مثلاً کسی کے یہاں تعزیت کے موقع پر یا کسی مریض کی عیادت کرتے ہوئے یا کسی کے یہاں بچے کی پیدائش پر تہنیت کے لئے جا کر اس کا موقعہ نکالا جاسکتا ہے۔

ج۔ اس میں آسانیاں ہوتی ہیں، اتنی مغزماری کی ضرورت نہیں پڑتی جتنی عمومی جلسوں یا مزاکرات وغیرہ میں ہوتی ہے اور اس میں داعی ہر طرح کی تنقیدی بندشوں سے بھی آزاد ہوتا ہے۔

د۔ یہ بہت آسان ہے چنانچہ دعوت پر ایمان رکھنے والا ہر شخص اس میں حصہ لے سکتا ہے چاہے وہ جاہل یا ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو اور اس میں کوئی مہارت نہ رکھتا ہو۔ اس

طرح یہ طریقۂ دعوت دعوتی کام کے لئے مشق وممارست کی ایک بہترین جولانگاہ بھی ہے جس میں صلاحتیوں کو پرکھنے کے کافی مواقع ہوتے ہیں۔

ہ۔ چونکہ یہ دعوت مخفی طریقہ سے انجام پاتی ہے اس میں داعی ہر طرح کی ریاونمود سے بھی محفوظ رہتا ہے، اس لیے کہ بیشتر اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑے بڑے مقررین اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے افراد "لاؤڈ اسپیکر کی بیماری" اور صدارت کے مرض" میں مبتلا رہتے ہیں۔

و۔ اس میں غور وفکر کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں کیونکہ اس میں ہر شخص کو اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ بیشتر اوقات اس کے سامنے نئی نئی باتیں آتی ہیں اور اس کے تعلق سے اس کے دل میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور مجمع عام میں کوئی اور اس کے سوالوں کا جواب دینے والا نہیں ملتا۔ چنانچہ وہ اس کا جواب حاصل کرنے کے لئے برابر جدوجہد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے اس سوال کا جواب پالیتا ہے۔

ز۔ پھر آزادانہ ماحول میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں آدمی اپنے شکوک وشبہات کو کافی آزادی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ ان کو ختم کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گفتگو کا یہ طرز نہایت مفید اور نفع بخش ہے اور اس طرح گفتگو میں اخوت ومحبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

ح۔ اس کی راہیں کبھی بند نہیں ہوتیں، یہ دعوت سخت ترین حالات اور مشکلات کے اندر بھی رواں دواں رہتی ہے اور پوری سرگرمی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اربابِ اقتدار اسے جتنا دبانے کی کوشش کرتے ہیں یہ اتنی ہی تیزی سے ابھرتی چلی جاتی ہے کیونکہ ایسے حالات میں تمام دلوں کی پکار ایک ہی ہوتی ہے اور لوگوں کے مسائل اور مشکلات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جس میں ظلم وزیادتی کی طاقت بری طرح ناکام رہتی ہیں۔

ط۔ اس میں نبوت کی برکتیں بھی رہتی ہیں کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کی ابتداء اسی طرح کی ہے اور پوری زندگی میں ان کی دعوت کا یہ طریقہ رہا ہے۔

اثرات:

آغاز کار میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انفرادی دعوت کے اثرات نہایت سست اور اس کے نتائج کم ہی بار آور ثابت ہوتے ہیں۔ کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس عظیم الشان معاشرے میں چند سو یا چند ہزار افراد کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی محدود دعوت کے ذریعے متوقع فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ ایک حد تک ان کا یہ اعتراض صحیح بھی ہے اور یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ جب اسباب میسر ہوں تو عوامی دعوت (اجتماعی دعوت) بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن طویل المدت کامیابی کے لئے انفرادی دعوت ہی بنیاد کا کام کرتی ہے، اور وہ لوگ جو انفرادی دعوت کے نتیجہ میں اطمینان حاصل کرکے قریب آتے ہیں وہی ہر دعوت کا اصل سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ گذشتہ صدیوں میں برپا ہونے والی اصلاحی تحریکات میں اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کی مثال انبیاء کرام علیہم السلام کے حواریوں اور مصلح قائدین کے پیروؤں کی سی ہوتی ہے اس طرح گویا انفرادی دعوت کی مثال اس بنیاد کی سی ہے جس پر عمارت کی تعمیر کی جاتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ انفرادی دعوتوں کے اثرات ہر حال میں محدود ہی ہوں۔ اس کے برخلاف کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی دعوت عوامی دعوت سے زیادہ زود اثر اور ناکامیوں سے دور ہوتی ہے۔

دعوت کے آداب:

گذشتہ سطروں میں ہم نے یہ بات کہی ہے کہ انفرادی دعوت حد درجہ نازک ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں دعوت کا تعارف کرانا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اس کے برے نتائج سے فرار بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔

داعی اس وقت غلطی کرتا ہے جب اسے یہ خیال ہو جائے کہ اس نے اپنے مخاطب کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے..... اسے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ضروری نہیں

ہے کہ جسے اظہار مدعا کی بہترین صلاحیت دی گئی ہو وہ اپنے خیالات کو بہترین انداز میں پیش بھی کرسکے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس نے اپنی بات بہترین انداز میں پیش کر دی ہے وہ مخاطب کو مطمئن بھی کر دے۔ پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ جسے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اس کی طرف سے کسی اچھے نتیجہ کا اظہار بھی ہو۔ کیونکہ انسان کے فکر و عمل کی تمام صلاحیتوں کو خیر کی طرف موڑ دینے کا کام نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت انسانی دوسرے راستوں کی طرف نکل بھاگنے کی کوشش کرتی ہے اور انسان اپنے اندرونی جذبات سے اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح اپنی عقل سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں درج ذیل چیزوں کی نشان دہی کرتے ہیں:

حلم و بردباری:

داعی کو دعوت کا کام بہتر طور سے انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلم و بردباری سے کام کرے۔ اور چونکہ دوسروں کی شخصیتوں سے وہ پہلے سے ناواقف ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے انہیں اچھی طرح سے سمجھ لے اور خیر و شر کی طرف سے ان کے میلانات کا پتہ لگالے۔

دعوت کا کام کرنے کے لئے اس کی واقفیت بہت ضروری ہے۔ اسے یکایک کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس کے نتائج کا اسے علم نہ ہو..... جی ہاں! داعی کے پاس ایک ایسا پیغام ہوتا ہے جو معاشرے کے اکثر لوگوں کے لئے بالکل نامانوس ہوتا ہے اور ان کے لئے اس میں کوئی کشش بھی نہیں ہوتی، نہ ان کے اندر اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کبھی بھی ان کی جانب سے اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم کھیت جو تنے اور اس میں بیج ڈالنے سے پہلے اس کی خاصیت بھی معلوم کر لیں کیونکہ بعض زمینیں بالکل بنجر ہوتی ہیں جن میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى۔ [الاعلیٰ: ۹/۸۷]

"پس تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔"

مخاطب کے جذبات کا احترام:

دوسری چیز جس کا لحاظ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ مخاطب کے جذبات کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے وہ آپ کا مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔اس لیے کہ رایوں میں اختلاف ناگزیر ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بناپر آپس کے تعلقات کو خراب کیا جائے۔اس لیے ضروری ہے کہ آپ دوسروں کی باتیں بھی اسی طرح سنیں جس طرح اپنی باتیں لوگوں کو سنانا پسند کرتے ہیں۔اپنے ناقد خود بنیں اور برابر سوچتے رہیں کہ آپ کے اندر کیا خرابیاں ہیں۔آپ بہت زیادہ تو نہیں بولتے؟...دوران گفتگو آواز بلند تو نہیں ہو جاتی؟...آپ کا انداز گفتگو جارحانہ تو نہیں؟ اپنے علم پر ناز نہیں ہے آپ کو؟...الفاظ کے لٹھ تو نہیں چلاتے؟

پھر اگر آپ کو یہ احساس ہو جائے کہ آپ غلطی پر ہیں تو بلا جھجک راہ حق اختیار کیجیے چاہے آپ کو معذرت ہی کرنی پڑے۔ایک آئیڈیل انسان بنئے تاکہ مخالفین جو ہمیشہ آپ کی غلطیاں ہی تلاش کرتے رہتے ہیں وہ آپ پر کیچڑ نہ اچھال سکیں اور اصل موضوع سے ہٹ کر ذاتیات کی طرف نہ مڑجائیں کہ اس میں مال ومنال اور جاہ مرتبت کا بھی سہارا لینا پڑے گا پھر یہ معاملہ حکومت اور عدالت تک پہنچے گا اور اس طرح شیطان کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ ابتداء ہی میں بہتر راستہ اختیار کریں تو آپ کی بحث عمدہ اور سلجھی ہوئی ہوگی۔علماء کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں گے تو باہمی اختلاف کو کوئی راستہ نہ مل سکے گا۔اب آپ سے اختلاف رائے رکھنے والے کے سامنے دو ہی راستے ہوں گے یا تو وہ آپ کی بات مان لے گا یا احسن طریقہ سے آپ سے جدا ہو جائے گا،آپ کا شکر گزار ہوگا یا آپ سے معذرت کردے گا اور آپ کے طرز گفتگو سے متاثر ہو کر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسری مرتبہ خود ہی ملاقات کا خواہش مند ہو،جو اس بات کی دلیل ہوگی کہ آپ اپنے مقصد میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہیں۔

حالات کا مطالعہ:

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں علم وحکمت کے دریا بہائے ہیں اور ہر قوم کو علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

وَعِنْدَ كُلِّ قَوْمٍ عِلْمٌ "ہر قوم کے پاس ایک علم ہے"۔

اور ایک قوم کے حالات کا لحاظ کرکے جو علم نہایت ضروری ہوتا ہے وہی علم دوسری قوموں کے حالات کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم حل مشکلات کا زینہ ہے لیکن خود علم کا ارتقاء بھی بہت سی الجھنیں پیدا کرتا ہے، اس لیے داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس فن کو سیکھے، لوگوں سے روابط رکھے اور ان کے خیالات کو سمجھے۔ شکوک وشبہات کے درمیان معرفت حقیقی کو تلاش کرتا رہے اور جب اسے کسی نئے ماحول میں کام کرنے کا موقع ملے تو صبر وسکون کے ساتھ کچھ دنوں تک اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرے، اس میں زیادہ عرصہ بھی صرف ہو سکتا ہے اور کم بھی۔ یہاں تک کہ وہ اس ماحول کو اچھی طرح سے سمجھ لے۔ پھر جب اس ماحول میں کام کرنے کا سلیقہ اسے آجائے تب کام شروع کرے۔ اور اگر ماحول کو سمجھے بغیر اس نے کام شروع کردیا تو اسے بہت سی پریشانیاں لاحق ہوں گی جو خود اس کے اور دعوت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا سبب بنیں گی۔

بنیادی اصولوں پر توجہ:

فکر انسانی کے کچھ بنیادی پہلو ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ راستہ مختصر ہونے کے باوجود ان پہلوؤں کو سمجھنے میں کافی وقت لگ جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جب داعی بحث کے بنیادی اصولوں کو سمجھ لے گا تبھی اس کے لئے یہ ممکن ہوسکے گا کہ خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ مثال کے طور پر آپ کسی سے اسلام کے موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اس بحث کے بنیادی نکات، ایمان باللہ، ایمان بالغیب، منقولات کی تصدیق اور معقولات کا ادراک ہیں۔ اور اگر مخاطب ان بنیادی چیزوں پر ایمان ہی نہیں رکھتا ہے تو اسے یہ بحث ختم کردینی چاہئے۔ اور دوسرے پہلو سے گفتگو کرنی چاہئے۔ اسی طرح اُس شخص کا معاملہ بھی ہے جس نے کسی کو اپنا لیڈر بنالیا ہو اور اس کی محبت میں اسے حق اور مصلحت عامہ کی بھی کوئی پرواہ نہ ہو تو اب اگر داعی اس سے واقف ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس سے اس انداز میں گفتگو

کرے کہ اس کے محبوب لیڈر پر اعتراض کئے بغیر بتدریج اسے اپنے مقصد تک لاسکے۔

داعی کو ہمیشہ کسی ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہئے جس میں وہ اپنے مخاطب کو حق کی لذت سے آشنا کردے،اس اثناء میں اس کے محبوب لیڈر سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہئے۔ اگر اس نے ایسا کر دیا تو گویا اس نے اس کے دِردل پر دستک دے دی اور اب اس کے بعد اسے پورا موقع مل سکے گا کہ حکمت اور صبر سے کام لے کر اس کے اندر حق کی تخم ریزی کرے اور باطل کے خودرو پودوں کو اکھاڑ پھینکے۔

اعترافِ حق:

دعوت کے آداب میں یہ بات بھی آتی ہے کہ داعی ایک فراخدل اور عالی ظرف انسان ہو۔اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ پہلے ہی سے بات طے کرلے کہ اسی کی بات مناسب اور ٹھیک ہے اور مخالف ،کافر، جاہل اور گناہگار ہے۔ایسا ہر گز نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ بحث کی بنیاد حقائق پر رکھنی چاہئے اور جیسے ہی داعی کو اپنے موقف کی کمزوری کا احساس ہو اسے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کئے بغیر مخاطب کی بات مان لینی چاہئے اور کسی دوسرے پہلو سے اپنی بات پیش کرنی چاہئے۔

فقہ اور شریعت کے درمیان فرق کرنا بھی ناگزیر ہے کیونکہ شریعت ہی وہ اصل بنیاد ہے جس کی صحت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔رہی فقہ تو یہ وہ چیز ہے جسے خود ہم نے شریعت سے سمجھا ہے۔اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا یا اس کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا یہ سب اجتہادی چیزیں ہیں،جس میں خطا وصواب دونوں کا احتمال ہے۔داعی کے لئے بعض معاملات میں شکست قبول کرلینا یا کم از کم اس کا مظاہرہ کرنا اپنی بات سمجھانے کے لئے نہایت مفید ہے۔

پھر اسے بحث اس وقت تک ہر گز نہیں کرنی چاہئے جب تک وہ بحث کے بنیادی نکات سے بخوبی واقف نہ ہوجائے اور یہ جان لے کہ کن دلائل سے اسے اپنے مخاطب کو قائل کرنا ہے۔معلوم ہوا کہ داعی جہاں مخاطب کو بہت کچھ دیتا ہے اس سے بہت سی چیزیں لیتا بھی ہے۔

متفقہ امور میں باہمی تعاون:

حکمت کے تقاضوں میں یہ بات بھی آتی ہے کہ داعی جب بحث وگفتگو میں ایک نتیجہ

پر پہنچ جائے تو اسے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ مخاطب کو عملی تقاضوں کی طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کرے کیونکہ نفس بحث مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ بحث تو ایک دوسری چیز کا زینہ ہے مقصود فی الواقع عمل ہے۔

پھر حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ داعی مخاطب سے اپنے فکری رشتہ اور تعلقات کی بنیاد استوار کرے تاکہ آنے والے دنوں میں یہی چیز آپس کے تعاون کی بنیاد بن سکے مثلاً: یہ کہ ایک ہی چیز کو آپ کا مخاطب قومی نقطہ نظر سے درست سمجھتا ہے اور آپ اسے دینی بنیاد پر صحیح سمجھتے ہیں۔ ہدف دونوں کا ایک ہی ہے، دونوں ایک ہی دشمن سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں باہمی تعاون سے اس دشمن سے نجات حاصل کرنے کا کام فی الواقع فروعی اختلافات سے بڑھ کر ہے۔ اور اس دائرے میں تعاون پر اتفاق سے کسی اور چیز کو مانع نہیں ہونے دینا چاہئے۔

حرص سے پرہیز:

بسا اوقات داعی اپنی گفتگو کے دوران جذباتی یا سیاسی موقف اختیار کرتا ہے اور اپنی بات کو حق سمجھ کر حریصانہ جذبات کے تحت دوسروں کے جذبات پر کبھی ہلکا اور کبھی گہرا زخم بھی لگا دیتا ہے۔ اس سے اکثر نقصان ہی ہوتا ہے کیونکہ اس طرز خطاب میں دوسروں کے دلوں کی رعایت نہیں ہوتی، حالانکہ یہی وہ چیز ہے جسے مطمئن کرکے پوری شخصیت کو سدھارا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مخلصانہ محبت اور ایثار، یہ وہ دو ہتھیار ہیں جو دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ایک داعی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مخاطب کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑکائے، اس سے مناظرہ کرنا شروع کردے، اسے اس کی بھی کوشش نہیں کرنی چاہئے کہ مخاطب اس کی بات مان ہی لے۔ داعی کے لئے یہ نہایت غیر مناسب ہے کہ وہ کسی بھی اسٹیج میں حریصانہ جذبات کو راہ دے، دعوت کا کام صرف اللہ کے لئے کیا جاتا ہے اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔

باب:۸

اجتماعی دعوت

اس میں داعی کے پیش نظر انسانوں کی ایک پوری جماعت ہوتی ہے جن کی زندگیوں کو بدلنا مقصود ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ خطابت ایک قدیم فن ہے جس کا آغاز نسل انسانی کی ابتداء سے ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ سنی ہوئی بات پڑھی ہوئی بات سے زیادہ متاثر کن ہوتی ہے کیونکہ اس میں زندگی، حرارت اور متاثر کرنے کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔

حقیقت واہمیت:

انبیاء اور رسولوں کو عوامی داعی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی دعوت کو ایسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کی خواہشات اور جذبات جداگانہ ہوتے ہیں اور اس طرح اس دعوت کے نتیجے میں بعض کو دباؤ، ظلم اور جبر کا سامنا کرنا پڑا اور کچھ کو شہید کر دیا گیا۔ لیکن یہ سب کے سب کامیاب سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ جو احکام و تعلیمات وہ لے کر آئے صدیاں بیت جانے کے باوجود آج بھی امتوں اور گروہوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

حکماء اور مجددین کو بھی داعی کہا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیائی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی عوام کے سامنے پیش کیا اور اس کے نتیجے میں ان میں سے بہتوں کو ظلم وجبر کا نشانہ بنایا گیا، انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کچھ کی پذیرائی بھی ہوئی۔ لیکن ان کے افکار زندہ رہے اور نسلاً بعد نسل ہم تک منتقل ہوتے رہے۔ لیکن وہ علم جو صفات کے دامن تک محدود رہا اس کا اکثر حصہ مٹ گیا اور کچھ باقی رہا بھی تو اس میں وہ تاثیر نہیں رہی جو سینہ بسینہ علم میں ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ان کے بہترین افکار، قیمتی خیالات اور زریں فکر کے حاملین کی تعداد ہر دور اور ہر زمانے میں لاتعداد رہی اور انہوں نے اسے اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچانے کے لئے حیرت انگیز طریقے اختیار کئے۔ مثلاً: یہ کہ اگر سو آدمیوں نے کوئی بات سنی اور اسے ان میں سے ہر ایک نے صرف پانچ آدمیوں تک پہنچایا تو پہلے ہی مرحلہ میں یہ تعداد پانچ

سو تک پہنچ گئی اور اگر ان پانچوں نے مزید پانچ افراد تک اسے پہنچا دیا تو دوسرے مرحلے میں یہ بات ڈھائی ہزار افراد تک منتقل ہو گئی۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہی بات مسلسل ایک صدی تک لوگوں میں پھیلتی رہے تو کتنے افراد تک پہنچ جائے گی۔

دعوت کا کام صحیح طور سے کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ داعی جس فکر کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اس پر خود اس کا گہرا یقین ہو، دِل ودماغ اس پر مطمئن ہوں، اس کے حدود اس کی صحت اور اس کی اثر انگیزی سے وہ بخوبی آگاہ ہو اور اس بات کا شدید خواہش مند ہو کہ دوسروں کے اندر بھی یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں۔یہ خوبیاں کیسے پیدا ہوں؟ اسے ایک مثال سے یوں سمجھنا چاہئے کہ دو مقررین تقریریں کرتے ہیں، لیکن ایک کی تقریر سے سامعین متاثر ہوتے ہیں اور دوسرے کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوتا، سننے والا ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ داعی دوسروں کو مطمئن کرنے سے پہلے خود مطمئن ہو جائے اور عمل سے پہلے اخلاص کا جوہر اس میں موجود ہو۔چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس دعوت دینے کے لئے بھیجا تو انہوں نے اس مہم کو سر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے جن چیزوں کی درخواست کی وہ یہ تھیں:

۱: پہلی بات تو یہ کہ حق رسالت کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ان کے دل کو کھول دے اور وہ اس لائق ہو جائیں کہ اس راہ کی مشکلات کو برداشت کر سکیں، چنانچہ فرمایا،

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ۔ [طٰہٰ:۲۰/ ۲۵]

"پروردگار! میرا سینہ کھول دے"۔

۲: دوسری چیز جس کی درخواست کی وہ یہ تھی کہ کارِ نبوت ان کے لئے آسان کر دے اور اس راہ کی پریشانیاں دور کر دے، چنانچہ فرمایا:

وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ۔ [طٰہٰ:۲۰/۲۶]

"اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔"

اس مختصر سے جملے نے دل کی نرمی، رقت، راہ کی مشکلات وشدائد کو دفع کرنے کی

التجا اور دشمنوں کی مخفی چالوں سے حفاظت ان سب کو سمیٹ لیا۔

۳: تیسری درخواست یہ کہ ان کی زبان کی گرہ بھی کھول دے اور ان کے کلام میں فصاحت اور تاثیر پیدا کردے تاکہ کار رسالت کی انجام دہی میں زبان وبیان کی کوئی مشکل پیش نہ آئے، چنانچہ فرمایا:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۔ [طٰہٰ:۲۰/۲۸،۲۷]

"اور میری زبان کی گرہ سلجھادے تاکہ وہ میری بات سمجھ سکے"۔

۴: چوتھی درخواست یہ کی کہ انہیں کے خاندان سے ایک رفیق اور معاون بھی عطا ہو جو قابل اعتماد اور امین ہو۔ فرمایا:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ وَاَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ

"اور میرے لئے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے، ہارون، جو میرا بھائی ہے اس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر"۔

۵: پھر انہوں نے اپنی دعا میں اس کی بھی وضاحت کردی کہ وہ اپنے رب پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہیں۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا

"تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں"۔

اسی طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں اپنے اس علم کا بھی اظہار کیا کہ وہ دلوں کے راز بھی جانتا ہے، اس لیے دعوت میں اخلاص اور حسن اطاعت بھی ضروری ہے۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا [طٰہٰ:۲۰/ ۳۵]

"تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے"۔

عوامی دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر ایسی صفات پائی جاتی ہوں جن کے ذریعہ وہ عوام کی محفلوں میں جاکر ان کے ذہنوں کو دعوت حق کی طرف موڑ سکیں اور ان کے افکار کو صحیح رخ دے سکیں۔ یہ صفات کچھ تو فطری ہوتی ہیں مثلاً: یہ کہ اسے دیکھ کر گھبراہٹ نہ محسوس کریں، آواز بلند ہو اور حرکت وعمل پر اسے قدرت حاصل ہو...ان

چیزوں کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو تعلیم وتربیت سے پروان چڑھائی جاسکتی ہیں مثلاً: یہ کہ خوش اخلاق ہو، نرم دل ہو، فہم وفراست اور قوت استنباط کا ملکہ رکھتا ہو۔

عبادتی امور سے متعلق خطبے:

ایک مسلمان داعی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اصول دین اور عبادات ومعاملات میں گہری دینی بصیرت رکھتا ہو اور اگر کبھی اس طرح کی چیزوں سے اسے سابقہ پیش آجائے تو بحسن وخوبی اسے انجام دے سکے۔ایسا ہر گز نہیں ہونا چاہئے کہ اگر اسے خطبہ عید یا نماز استسقاء پڑھانے کے لئے بلایا جائے تو وہ بہتر ڈھنگ سے اس فرض کو انجام نہ دے سکے۔ (ایک داعی کو چاہئے کہ وہ فرضی و نفلی نمازوں ، عیدین، جنازہ، نماز کسوف، استسقاء ، نماز جمعہ، نکاح کے مسنون طریقے اور خطبات میں مہارت حاصل کرے۔اس لیے کہ یہ موقع بھی عوامی دعوت میں لوگوں تک دعوت الی اللہ پہنچانے کے لئے بہترین و موزوں ہوتے ہیں۔اسی طرح سورج گرہن اور چاند گرہن کی نماز اور خطبے بھی وہ مذکورہ بالا مواقع کے متعلق شریعت مطہرہ کی فراہم کردہ رہنمائی پر مکمل عبور رکھتا ہو تاکہ بوقت ضرورت عوام کو قرآن وسنت کی روشنی میں مکمل راہنمائی فراہم کرسکے۔اور ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر عوامی اجتماعات میں دعوت پہنچا کر بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرے)۔

شرعی تقریروں میں قابل لحاظ امور:

پہلی چیز جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ تقریریں زیادہ لمبی نہ ہوں جنہیں سنتے سنتے سامعین اکتا جائیں ، خطبے وہی اچھے ہوتے ہیں جنہیں عامۃ المسلمین ایک جگہ بیٹھ کر طہارت کی حالت میں خاموشی ، سکون اور رضا ورغبت سے سن سکیں۔اس کا لحاظ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں عورتیں ، بچے ، بوڑھے اور کمزور سبھی رہتے ہیں۔ جن کی رعایت بہر حال ضروری ہے۔دوسرے یہ کہ موسم کا بھی لحاظ کیا جانا چاہئے ، کبھی سخت سردی پڑتی ہے ، کبھی سخت گرمی توان تمام حالتوں میں سکون کے ساتھ کوئی چیز سننا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

دوسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ مقرر اپنی تقریر میں کسی فرد یا جماعت کو ہر گز مجروح کرنے کی کوشش نہ کرے ، اور نہ کسی کی تعریف ہی میں مبالغہ کی حد

سے گزرے، کیونکہ داعی کاکام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلانا ہے البتہ اگر کوئی اہم معاملہ ہو تو دنیاوی موضوعات پر بھی گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ویسے تو عام مقررین کو مکمل تیاری کرکے ہی تقریر کرنی چاہئے لیکن اگر کوئی خطیب برجستہ بولنے پر قادر ہو اور وقت اور موضوع کو دوران تقریر بھولتا نہ ہو تو اس صورت میں برجستہ بولنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

داعی کو ہمیشہ لوگوں کے سامنے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور خشوع ووقار کو برقرار رکھنا چاہئے، کیونکہ داعی کی حیثیت دین میں پیشوا کی ہوتی ہے۔

موثر خطبے:

دعوت کے یہی طریقے عوام الناس کے درمیان زیادہ مقبول ہیں اور ان سے عوام کے اندر جوش وولولہ اور عملی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

خطابت کوئی آسان فن نہیں ہے اسے بہت کم لوگ بہتر ڈھنگ سے کر پاتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں اور خود جماعتی سطح پر بھی خاص طور سے اس کی ٹریننگ کی جائے کیونکہ یہ ان اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے جن پر ہماری دعوت کا انحصار ہے۔

ایک اچھے خطیب کا دل اس کے دماغ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔اس لیے داعی کی دعوت اسی وقت موثر ہوتی ہے جب اس کے دل میں جذبات کی گرمی اور دماغ میں معلومات کا خزانہ ہو،ان دونوں میں سے کسی ایک چیز میں کمی ناکامی ونامرادی کا سبب بن سکتی ہے،

آئندہ صفحات میں ہم ایک اچھے مقرر کی بعض قابل لحاظ خوبیوں کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کریں گے۔خوبیوں کی یہ تقسیم محض بات کو آسان بنانے کی غرض سے ہے ورنہ فی الاصل یہ تمام خوبیاں ایک کل ہیں ان کو اجزاء میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔

عوامی دعوت کے آداب

(۱) حسن انتخاب:

مقرر کو چاہئے کہ وہ بہترین مضامین کا انتخاب کرے اور اس سلسلہ میں درج ذیل چیزیں قابل لحاظ ہیں:

موضوع کا انتخاب:

مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے موضوع کا انتخاب کریں جو سامعین کو باادب، مہذب اور سلیقہ مند بنانے میں مدد ومعاون ثابت ہوسکے۔مثال کے طور پر درج ذیل موضوعات ملاحظہ ہوں: گفتگو اور خاموشی، معاملات میں مشورہ، رازوں کی حفاظت، صبر اور بے صبری، ہنسی مذاق، مروت و پاسداری، طلب علم یا معاشرتی آداب مثلاً: کھانا پینا، سلام دعا، دوسروں کی خدمت، وضع قطع۔لوگوں سے تعلقات کی نوعیت وغیرہ یا مثلاً: تہذیب وسلیقہ مندی، اعلیٰ اخلاق، سچ اور جھوٹ، حیاء، خاکساری و تکبر، حسن اخلاق، دین کے اصولوں کا فہم، دوست کے حقوق، صحت و فارغ البالی، عمل کے مواقع، ہمدردی و غم گساری، عقل اور نفس پرستی، دعوت وتبلیغ کا طریقہ، کام اور کارکن کی اہمیت، مالداروں پر مال کے حقوق، عقائد کی اصلاح، غیر اسلامی خیالات سے واقفیت، سنت و بدعت، افراد کی زندگیوں میں شریعت کی اہمیت وغیرہ۔جو ادارے مسلسل اجتماعات کا انعقاد کرتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ وہ سالانہ وششماہی کے لحاظ سے اپنا ایک نقشہ مرتب کرلیں جس میں انسانی زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر کارآمد اور نفع بخش مذاکرے اور تقریریں وغیرہ کرائی جائیں۔ان مذکرات کے موضوعات اس طرح ہونے چاہئیں۔اجتماعی خدمت، فن طب کی وسعت، مختلف ممالک کے مسائل یا تاریخی، دینی، جغرافیائی موضوعات پر بحث ومباحثہ، عجیب وغریب مخلوقات، دور جدید کی ایجادات واکتشافات، اسلامی معیشت وتجارت، جدید معاملات، جدید مسائل، اسلام کا نفاذ عدل، نفاذ شریعت کے فوائد، اسلام کا نظام حیات وغیرہ جیسے موضوعات پر اظہار خیال کروانا چاہئے۔اس کے لئے بہترین مقررین کو بلایا جائے۔اسپیکر کلب قائم کئے جائیں، مقررین کے لئے وقت مقرر کیا جائے اور سلیقہ کے ساتھ اس کو CONDUCT کیا جائے۔

الفاظ اور جملوں کا انتخاب:

تقریر کا یہ نہایت اہم جز ہیں اس لیے داعی کو ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ جو آسان ہوں اور مخاطب کے لئے مانوس ہوں۔ ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، یہ وہ چیز ہے جس کا لحاظ خود قرآن مجید نے کیا ہے۔اس لیے داعی کے لئے اس کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے۔ویسے اس کا میدان تو کافی وسیع ہے لیکن مختصراً ہم اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

خطیب کو آسان ،واضح اور چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرنے چاہئیں۔ عبارتوں کا مقفع و مسجع ہونا ضروری نہیں ہے،اس سے بات گنجلک ہو جاتی ہے اور کچھ سامعین اس میں تحریف کرکے غلط معنی پہنادیتے ہیں، بعض تحریفیں اچھی نیت سے بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر لوگ غلط تاویل کرتے ہیں، اس لیے بات دوٹوک کہنی چاہئے اور ایسے الفاظ استعمال کئے جانے چاہئیں جس کو غلط معانی نہ پہنائے جاسکتے ہوں۔ پھر وہ مسائل جو عوام کے نزدیک متفق علیہ ہیں اگر ان میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے تو بلاوجہ اس میں اختلاف بھی نہیں کرنا چاہیے، عوام کو ایسے اختلافی مسائل میں الجھانا جو انہیں الگ گروہ بنادیں اور ان کو فرقوں میں بانٹ دیں بالکل غیر مناسب ہے۔اللہ نہ کرے اگر کہیں سے اختلافات کی آگ بھڑکائی جارہی ہے تو اسے بجھانے کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ فرقہ بندی اور گروہ بندی کو ختم کرکے ہی لوگوں کے درمیان الفت و محبت کے بیج بوئے جاسکتے ہیں۔اور لوگوں کے درمیان الفت و محبت پیدا کرنا نیز انہیں (قرآن وسنت کی تعلیمات پر متفق کرکے) ایک پلیٹ فارم پر جمع کردینا ہماری دعوت کا اہم مقصد ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ داعی مانوس الفاظ اور مروجہ محاوروں ہی کا استعمال بھی کرے۔ داعی کو تو نئے نئے الفاظ جدید استعارات و تشبیہات اور ادبی کنایات کا استعمال بھی ضرور کرنا چاہئے بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ مناسب موقعوں پر پہلے سے تیاری کر کے اسے تقریر کرنی چاہئے۔ ایسے مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور دعائیں جو آپ نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر مانگی تھیں یاد رکھنا چاہیے مثلاً: تعزیت و تہنیت کی دعائیں شادی بیاہ کے موقعوں پر کی جانے والی دعائیں بارش کی دعا وغیرہ۔اسی طرح ادبی شہ

پارے، بہترین اشعار، قرآن کریم کی آیتیں اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یاد رکھنے چاہئیں تاکہ ضرورت کے وقت ان سے استدلال کیا جاسکے۔

مناسب وقت کا انتخاب:

اچھے مقرر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لئے ایک ایسے وقت اور موقع کا انتخاب کرتا ہے جو سامعین کے لئے پر مشقت اور گراں بار نہ ہو، یہ مناسب نہیں ہے کہ خطبہ جمعہ جس میں لوگ جلد واپس لوٹنے کے لئے بے چین رہتے ہیں ایک لمبی تقریر شروع کردے یا سخت سردی یا سخت گرمی کے موسم میں وعظ کہنے لگے یا مثلاً: کسی کو بہت جلدی ہے اسے میت کی تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹانا یا گاڑی وغیرہ پکڑنی ہے تو اسے پکڑ کر شوق تبلیغ پورا کرنا شروع کردے۔

مناسب جگہ کا انتخاب:

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ مقامات کسی مجلس کے انعقاد یا اجتماع وغیرہ کے لئے موزوں نہیں ہوتے مثلاً: کارخانوں کے آس پاس جہاں ہر وقت ایک ہنگامہ سا برپا رہتا ہے یا ایسی جگہ جہاں اجتماع کرنے سے قرب وجوار کے لوگوں کو تکلیف ہو یا ایسی جگہ جہاں رقص وسرود کی محفلیں آراستہ ہوں یا ایسی جگہ جہاں دو لیڈر ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر اپنی لیڈری کا سکہ جمانے کے چکر میں ہوں یا کسی ایسی جگہ کا انتخاب جو آبادی سے دور کسی سنسان مقام پر واقع ہو، ایسی جگہوں کا انتخاب صحیح نہیں ہے۔

(۲) حکمت عملی:

حاضر جوابی:

ایک چیز جو اکثر وبیشتر داعی اور خطیب کو پیش آتی ہے وہ حاضر جوابی ہے، وہ یہ کہ اچانک پیش آمدہ مسئلہ میں خوش اسلوبی سے کیسے عہدہ برآ ہوا جائے۔ کبھی کبھی مخاطب پہلے ہی سے اپنے ذہن میں کچھ سوالات تیار کئے رہتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ خطیب کے خاص رجحانات کو جانچ سکے اور کبھی سوالات ایسی چیزوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو اس سے غیر متعلق اور دائرہ بحث سے خارج ہوتے ہیں۔ایک اچھے خطیب کو جاننا چاہئے کہ ایسے مواقع پر

کیا کرے کہ تقریر کا تسلسل بھی ختم نہ ہو اور جواب بھی غلط نہ ہو۔

میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جسے فن تقریر کا امام کہا جاتا تھا۔ایک مرتبہ دوران تقریر ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ "آپ کی یہ بات غلط ہے" مقرر تاڑ گیا کہ وہ اسے زچ کرنا چاہتا ہے۔اس نے فوراً یہ کہہ کر اس کی بات کاٹ دی کہ یہ صرف آپ کی رائے ہے اور اپنی بات جاری رکھی۔

اسی طرح ایک استاد کی نگرانی میں ایک طالب علم "تدریسی تربیت " teaching trainingcorse کے اسباق کا امتحان دے رہا تھا۔ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر ایک سوال پوچھا جس کا جواب اسے معلوم نہیں تھا لیکن طالب علم حاضر جواب تھا،اس نے فوراً کہا،اسے دوسری گھنٹی میں پوچھ لینا، لیکن جب دوسری گھنٹی بجی تو تمام طلباء کلاس سے باہر نکل کر مدرسہ کے صحن میں دوڑنے لگے ،اس ہماہمی میں سائل طالب علم اپنا سوال بھول چکا تھا۔ اس پر استاذ نے درج ذیل نوٹ چڑھایا" طالب علم نہایت ہوشیار اور حاضر جواب ہے۔"

مباحثہ:

داعی کو باادب سلیقہ منداور خوش معاملہ ہونا چاہیے اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

- اپنے حافظہ کی ایسی تربیت کرے کہ وہ لوگوں کے نام نہ بھولے خصوصاً ایسے لوگوں کے جو صاحب مرتبہ ہوں۔ داعی کی زندگی میں مسلسل دوڑ دھوپ کرنے کی وجہ سے متعدد لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے لوگ اسے پہچان لیتے ہیں اور اس کا نام لے کر اسے پکارتے ہیں، اس لیے داعی کے لئے نامناسب ہے کہ وہ ان کا نام بھول جائے جبکہ اس سے پہلے وہ اپنا تعارف کرا چکے ہیں۔ کسی کا نام یاد رکھنے سے اسے اپنے تشخص کا احساس ہوتا ہے۔
- مخاطب کی بات کو اسی طرح توجہ سے سنے جس طرح وہ خود اپنی بات پر توجہ چاہتا ہے۔ اس کی بہتر شکل یہ ہے کہ جب مخاطب گفتگو کرے تو وہ خاموش رہے ایسا معلوم ہو گویا وہ بہت توجہ سے اس کی بات سن رہا ہے۔
- اپنے سے پہلے گزرے ہوئے مقررین کی باتیں بطور استدلال نقل کرے کیونکہ اس

سے ذہن کی حاضری کا اندازہ ہوتا ہے اور خاکساری کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

- لوگوں کی جو چیزیں قابل تعریف ہوں ان کی تعریف بھی کرے کیونکہ یہ فطری چیز ہے کہ جو شخص تعریف کرتا ہے وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ البتہ تحسین بے جا نہیں ہونی چاہیے۔

اختلافات سے گریز:

کسی بہترین خطیب کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ اپنی تقریر کی ابتداء دوسروں کی رایوں سے اختلاف اور ذہنوں میں جمے جمائے خیالات ومعتقدات پر تنقید سے کرے۔ اگر اختلاف ناگزیر ہو تو دوسروں کی بات نقل کردے اور خود ایسا معلوم ہو جیسے وہ خود بھی اس سے ناواقف ہے۔ بعض جگہوں پر بہت سی دوسری جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہوتی ہیں ایسے مواقع پر کسی ایک کی طرفداری کرنے سے دوسروں کے اندر اس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مناظرہ ومباحثہ سے کوئی بہتر نتیجہ نہیں نکلتا، اس لیے متکلم جب تک بتدریج ذہنوں کو اپنی بات کے لئے ہموار نہ کرلے تب تک اسے مخاطب کے سامنے اپنی بات نہیں رکھنی چاہیے۔ مثلاً دو گروہوں کے درمیان ترجیح دینے کا مسئلہ ہے، ہمیشہ بات کی ابتدا ان موضوعات سے کی جانی چاہیے جو اختلافی امور سے بالکل الگ ہوں۔

مخاطب کو تنگی میں نہ ڈالیں:

حرج کا مطلب یہاں یہ ہے کہ ہم اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے مخاطب کو کسی ایسے مسئلہ میں نہ پھنسادیں جس سے نکلنا اس کے لئے ناممکن ہو اور اس پر وہ دل ہی دل میں کڑھے۔ داعی کا اپنے مخاطب کو اس طرح کے مسائل میں الجھانا مناسب نہیں ہے۔ مخاطب کو کسی کام کے لئے زحمت دینا یا کسی قربانی کا مطالبہ کرنا اس وقت تک مناسب نہیں ہے جب تک وہ اسے اپنے لئے پر مشقت اور گراں بار سمجھ رہا ہو۔ اور اسے کرنے کے لئے اس کے اندر آمادگی نہیں ہے یا اس کے دل میں اس کے لئے پوری طرح تائید وتصدیق موجود نہیں ہے۔ اس طرح کی ایک غلطی کا مشاہدہ ہم نے ایک گاؤں میں کیا جہاں مریضوں کو طبّی سہولیات دینے کے مسئلہ پر ایک اجتماع منعقد کیا گیا جس میں بہت سے مقررین نے حسب لیاقت اظہار خیال کیا۔ ایک مقرر

صاحب اسٹیج پر آئے اور انہوں نے اپنے دل سے گھڑ کر یہ بات کہی کہ فلاں صاحب نے اس نیک کام کے لئے اتنی زمین وقف کر دی ہے۔ اتفاق سے وہ صاحب جن کے بارے میں یہ بات کہی گئی تھی وہ بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے سنا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ کیونکہ اس طرح کی کوئی بات انہوں نے مقرر صاحب سے نہیں کہی تھی۔ پھر جب جلسہ ختم ہو گیا تو کمیٹی کے افراد مذکورہ صاحب کے یہاں چندہ لینے پہنچے تو اس پر وہ آدمی غصہ ہوا اور ان لوگوں کو خوب برا بھلا کہا۔۔۔ یہاں پر مقرر کی حسن نیت سے قطع نظر اس طرح کی بات کہنا نہایت غلط تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر اسے معذرت کرنی پڑی۔

طوالت سے پرہیز:

مبلغین اور مقررین کی سب سے بڑی آفت طوالت ہے حالانکہ اس سے دعوت کو فائدہ کے بہ نسبت نقصان زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس کی خامیوں اور خرابیوں سے متنبہ کرنا ضروری ہے۔ ذیل میں ہم اسی کے متعلق گفتگو کریں گے۔

مقرر لمبی تقریر درج ذیل وجوہ سے کرتا ہے۔

- مقرر اپنے بارے میں خوش گمانی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے لوگوں کے لئے نیا ہے اور اس تصور کو اس وقت اور بھی جلا ملتی ہے جب دوسرا اس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے، اسی کا دوسرا نام کبر وغرور ہے۔

شہرت پسندی اور تعریف کی خواہش ہو جاتی ہے، یہ ریا کی قسم ہے، داعی کو اس شرک خفی سے خود کو بچانا چاہیے۔

- بسا اوقات غفلت اور نسیان کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسروں کے مفادات اس کے پیش نظر نہیں ہوتے اور کبھی کبھی یہ خوش گمانی بھی طوالت کا سبب بنتی ہے کہ متکلم سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تقریر حد درجہ نفع بخش ثابت ہو رہی ہے۔ اور کبھی کبھی خود موضوع ہی ایسا ہوتا ہے جسے مختصر لفظوں میں سمیٹنا ناممکن ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ میں سے کوئی بھی وجہ ہو لیکن داعی کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ امت

ایک طویل عرصہ سے لاطائل بحث ومباحثہ اور لاحاصل مناظرہ بازی میں الجھی رہی ہے۔ اس لیے اب اس کے سامنے لمبی لمبی تقریریں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا ہے۔

فائدہ اگر ہو تو صرف اس سے کہ:

۱: طویل اور بے مغز تقریروں کے بجائے مختصر اور پُر مغز تقریر کرے کیونکہ آدمی کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی ایک ہی چیز پر متوجہ نہیں رہ سکتا۔

۲: چونکہ عموماً لوگوں کی ذہنی قوت بہت کم ہوتی ہے اس لیے مسلسل ۱۵ منٹ سے زیادہ توجہ کرنا عموماً ناممکن ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد یا تو ذہن تھک جاتا ہے یا طبیعت اکتا جاتی ہے اور کچھ دیر آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر کسی دینی موضوع پر گفتگو عام طور پر لوگوں کے لئے نئی ہوتی اور ہر وہ شخص جس کی عمر تیس سال سے زائد ہو تو اس نے دسیوں مرتبہ ان موضوعات پر تقریریں سنی ہوں گی۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ وہ پرانی بات جسے مخاطب جانتا ہے نہ دہرائی جائے بلکہ اس میں کچھ نئی باتیں بھی ہوں اور جب نئی باتیں تلاش کرکے بولے گا تو بات مختصر بھی ہوگی اور جامع بھی۔

۳: بعض لوگ یہ کہہ کر کہ "اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو....." اس غیر فطری چیز کو جائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے کسی طرح بھی مستحسن نہیں کہا جاسکتا۔

۴: اس کے برخلاف بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ کہیں تقریر میں طوالت کا عیب نہ ہو جائے وہ اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دیتے ہیں جس سے ان کی بات ہی معمہ بن جاتی ہے، یہ طریقہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی سے وقت اور موضوع متعین کر لیا جائے اور اسی کا خیال کرتے ہوئے اپنی بات لوگوں کے سامنے رکھی جائے۔

مسائل کا ادراک:

دنیا کے بدلے ہوئے حالات نے بہت سے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جنہوں نے انسان کے ذہن وفکر پر اپنا قبضہ جمار کھا ہے اور اس کے علاوہ اسے اور کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں

مل پاتا۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے پیدا ہونے والے تمام سوالات کے تشفی بخش جواب دے کیونکہ وہ بھی انسانوں ہی کا ایک فرد ہے اور خود اسے بھی اس طرح کے مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے جب کوئی نیا مسئلہ اس کے سامنے رکھا جائے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ اس پر مخاطب کے ذہن میں کیسے کیسے سوالات ابھر سکتے ہیں اور انہیں کیونکر مطمئن کیا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ متعلقہ مسئلہ پر سوچنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہو۔ مخاطب کے ذہن میں اس پر کیسے کیسے سوالات ابھر سکتے ہیں؟ ان کا تشفی بخش جواب کیا ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کہ ان جوابات پر بھی کوئی اعتراض وارد تو نہیں ہوتا اگر ہوتا ہے تو اس کی وضاحت کیسے کی جائے؟

سوچنے کا یہ انداز ذہنوں کو مطمئن کرتا ہے اور متکلم کی ذہانت اور مشکلات کے حل کرنے میں غیر معمولی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے، پھر اس سے وقت بھی بچتا ہے۔

داعی کے لئے ماضی میں گزری ہوئی اہم اہم تنظیموں سے اچھی طرح واقف ہونا بھی ضروری ہے پھر اس مطالعہ کو برابر جاری بھی رکھے تاکہ ان تحریکات نے دنیا پر نیک وبد جو اثرات مرتب کئے ہیں ان سے آگاہ رہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اخبارات ورسائل کا مطالعہ بھی کرے اور خبریں بھی سنے اور ایک واقف کار کی طرح اس کا تجزیہ بھی کرتا رہے۔ کسی معاملہ میں کوئی سرسری اور سطحی رائے قائم نہ کرے، کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے دوستوں اور دشمنوں کی تمام چیزیں اچھی طرح سے پڑھ لے۔ اس طرح توقع ہے کہ وہ اپنے علم کی پیاس کو بجھائے گا اور دعوت کا کام بہتر طور سے انجام دے سکے گا۔

پھر یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جو لوگ اس میدان میں کام کر رہے ہیں انہیں ایسی مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آئے گا جو اس دعوت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی پوری کوشش کریں گی کیونکہ اس دعوت کو اپنے آغاز ہی سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ مخالفتیں کبھی تو خفیہ چالوں کی شکل میں ہوتی ہیں اور کبھی ارباب اقتدار کی جانب سے اور کبھی ظلم وزیادتی اور سینہ زوری کے بل پر کی جاتی ہیں۔ پھر اتنی بات بھی ہرگز کافی نہیں ہے کہ آپ صرف بیج بو دیں اور ان آفات ومصائب سے لاپرواہ ہو جائیں جو عموماً دعوت کے راستے میں پیش آتی ہیں اور اس کے نشوونما وارتقاء میں مزاحم ثابت ہوتی ہیں۔ یہ نکتہ نہایت تفصیل طلب ہے یہاں ہم صرف

اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

معلوم سے نامعلوم کی طرف چلیں:

کسی بات کو منوانے کے لئے ضروری ہے کہ تسلیم شدہ حقیقتوں کو لے کر بتدریج اپنی بات ذہن میں بٹھائیں مثلاً جب آپ اپنے مخاطب کو دعوت کی ذمہ داریاں یاد دلانا چاہتے ہوں تو اس طرح کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے اور دوسری تمام مخلوقات پر ہمیں فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح اس عظیم نعمت کے لحاظ سے ہمیں ایسی عظیم ذمہ داری بھی تفویض کی ہے اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس احسان کی قدر کرتے ہوئے حق کی معرفت حاصل کریں اور لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ رکھیں:

یاد رکھنا چاہیے کہ داعی کی مثال ایک کشتی کے ملاح کی سی ہے جس کی کشتی بھنور میں پھنس چکی ہے اور ایک ذرا سی غفلت خود اس کی اور کشتی کے سواروں کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر توجہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

- داعی کے اندر ایسی کوئی بات نہ پائی جاتی ہو جو غیر فطری ہو۔
- اگر کوئی بات سمجھانے کے لئے کفار یا منافقین کی مثال بیان کرنی ہو تو جماعت کے افراد کو بطور مثال نہ پیش کریں۔
- معاشرے کی ایسی اجتماعی عادتیں جو ذہنوں میں جم گئیں ہوں ان پر بے تحاشہ تنقید نہ کرے۔
- اس کا لباس، طور طریقہ، چال چلن ایسا نہ ہو جسے عام طور پر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔
- معاشرے کے علماء کو جہلاء اور عقل مندوں کو بے وقوف نہ کہے اور خود کو دوسروں سے بڑا نہ سمجھے۔

یہ تمام چیزیں اگرچہ نہایت حقیر ہیں لیکن داعی کے لئے ان کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۳) حسن ادا:

اس عنوان کے تحت مقرر کی بہت سی چیزوں کو شامل کیا جا سکتا ہے، یہاں صرف قابل لحاظ چیزوں ہی کا تذکرہ کریں گے۔

آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے ہو:

داعی کا سارا کام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہوتا ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا مرجع اور منبع ہے، اس لیے کوئی بھی کام کرتے ہوئے اگر ہم اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے نہ کریں تو یہ ہماری سخت غلطی ہو گی۔ اس لیے اس کا لحاظ ضروری ہے۔

مواد کا استحضار:

اس کے بعد سب سے اہم چیز جسے برتنے کی ہم خطیب کو مشورہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ موضوع اس کے ذہن میں اچھی طرح سے مستحضر رہنا چاہیے بلکہ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ بنیادی مسائل کو پہلے ہی ایک چھوٹے سے کاغذ پر نوٹ کرے تاکہ ضرورت پڑنے پر فوراً اسے دیکھ سکے ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ دوران تقریر یا تو وہ بھول جائے گا یا پھر ہکلانا شروع کر دے گا یا کہی ہوئی بات کو پھر سے دہرانے لگے گا۔ یہ تمام چیزیں تقریر کو بے جان کر دیتی ہیں۔ اس لیے ان کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے پھر جب مقرر اپنی بات کہہ چکے تو تقریر کو مزید طول دینے سے بہتر یہ ہے کہ اسے وہیں ختم کر دے۔

پر کشش آغاز:

بعض مقررین مخاطب کے شوق و دل چسپی کو عجیب و غریب مہارت کے ساتھ ابھارتے ہیں اور اپنی بات کہنے کے لئے نہایت مناسب تمہید باندھتے ہیں مثلاً کبھی تقریر کا آغاز کسی دل چسپ واقعہ سے کرتے ہیں اور کبھی آغاز ہی میں کوئی حیرت انگیز نکتہ پیش کر کے مخاطب کے آتش شوق کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ تقریر کرنے کا نہایت عمدہ اسلوب ہے، اس لیے داعی کو تقریر کے آغاز میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نیز منتخب شہ پارے اور جواہر پارے پیش کرنے چاہییں۔ اس طرح سامع کو جب مقرر کے خلوص نیت اور اس کی انتھک کوششوں اور محنتوں کا علم ہو گا تو اس کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بڑھ جائے گی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ وہ داعی جو اپنی دعوت کو خالص عربی زبان میں صرف عربوں کے لئے پیش کرتا ہے اور وہ داعی جو بحث کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرنے کے بعد اس سے ایک نتیجہ نکالتا ہے پھر اس کی تائید میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کرتا ہے، تو ان دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

وقار اور سنجیدگی:

حسن اداء کے ضمن میں ایک بات یہ بھی آتی ہے کہ مقرر دوران تقریر ایکٹروں کی طرح بہت زیادہ اشارے کرنے اور مڑمڑ کر ادھر ادھر دیکھنے سے گریز کرے، اشارات وہی اچھے لگتے ہیں جو پُر وقار اور سنجیدہ ہوں۔ اور اگر ذرا آگے بڑھ کر کوئی بات کہنی ہو تو چال میں لڑکھراہٹ نہیں آنی چاہیے۔ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ جملہ حاضرین پر نظر رہے ایسا نہ ہو کہ ایک ہی فرد کو تکتا ہی چلا جائے اور دوسری طرف نظر صرف اتفاقاً ہی اٹھ جائے تو اٹھ جائے۔

بات کو موثر بنانے کا یہ طریقہ ہر گز نہیں ہے کہ دوران تقریر تو مقرر کافی گرم مزاجی اور اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرے لیکن جب وہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں جائے تو لوگ اسے لہو لعب میں مشغول پائیں اور ہنستے کھیلتے ہوئے وہ اپنی زندگی گزار دے، اس سے بات کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ ضروری ہے داعی اپنی کہی ہوئی بات کا نمونہ ہو اور ذمہ داری کا احساس اس کے اندر شدید سے شدید تر ہو، اس کے برخلاف اگر وہ ہنسوڑ مزاج ہوا تو وہ گفتار کا غازی تو بن سکتا ہے کردار کا نہیں۔

داعی کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور ظاہر داری کا لحاظ عوام کے متوسط الحال طبقہ کی طرح کرے، کپڑے صاف ستھرے دھلے ہوئے اور شائستہ انداز میں پہنے۔ ایسے کپڑے نہ پہنے جسے عام طور پر لوگ ناپسند کرتے ہوں یا ان سے مغربیت کی بو آتی ہو۔

آواز میں اعتدال:

اپنی بات جلدی جلدی کہہ ڈالنے کی دھن میں ایسا ہر گز نہیں ہونا چاہیے کہ مقرر اپنی باتوں کو غلط سلط بیکار چیزوں سے بھر دے اور نہ ہی تکلف کرتے کرتے ربڑ کی طرح پھیلا دے

اس سے مخاطب کا ذہن پریشان اور پراگندہ ہوتا ہے اس لیے تقریر میں بہت زیادہ جلد بازی کرنا یا حد سے زیادہ ٹھہر ٹھہر کر بولنا غیر مناسب ہے اور سامع اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔

بعض مقررین عجیب وغریب لہجہ اختیار کرتے ہیں کچھ دیر تک تو وہ آہستہ آہستہ اور معتدل انداز میں تقریر کرتے ہیں پھر بتدریج آواز پست کر دیتے ہیں پھر اچانک چیخ پڑتے ہیں اور اس طرح لہجہ بدل بدل کر اپنی تقریر پوری کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء تو نہایت پر سکون انداز میں کرتے ہیں پھر انہیں جوش اور گرمی آجاتی ہے اور کچھ ہی دیر کے بعد ان کی آواز پھٹ جاتی ہے اور گلا ساتھ نہیں دے پاتا اور جب وہ تقریر ختم کرکے نیچے آتے ہیں تو پسینہ سے تر بتر ہوتے ہیں اور ان کی یہی عادت برابر رہتی ہے۔

تقریر ہمیشہ معتدل لہجہ میں کرنی چاہیے اور اس کے لئے اچھی خاصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے تب کہیں جا کر تقریر کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

مواد کی تقسیم:

مواد کی تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ مقرر سامعین کو اپنی بات اچھی طرح سمجھانے کے لئے تقریر کو چند اجزاء میں تقسیم کر دے (مثلاً: کسی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ یوں کہے کہ اس مسئلہ کی تین بنیادیں ہیں یا یوں کہے کہ آج ہم چار باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں پہلی بات یہ ہے کہ۔۔۔) اور اس تقسیم کو نظر میں رکھ کر تقریر شروع کرے۔

اس طریقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ مخاطب اگر بات کی پوری تفصیل یاد نہ رکھ سکے گا تو ان بنیادی چیزوں کو ضرور سمجھ جائے گا اور اپنی عقل کے موافق ان میں سے ہر ایک کی توضیح بھی خود ہی کرے گا۔ اس طرح باتیں ذہنوں میں محفوظ ہو جائیں گی اور ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں رہے گا کیونکہ کسی بات کو کسی دائرہ میں گھیر دینے یا اس کو اجزاء میں تقسیم کر دینے سے بات جلد سمجھ میں آجاتی ہے اس کے برخلاف اگر ادھر ادھر کی باتیں ملا کر بے ترتیب کوئی بات کہی جائے جس کا کوئی سر ہو نہ پیر تو اس کا اول آخر سب بھول جاتا ہے۔

تاریخ سے استدلال:

لوگوں کو گزرے ہوئے واقعات یاد دلانے یا انہیں تاریخ کی گہرائیوں میں لے جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کو اس غرض سے بیان کرنا چاہیے تاکہ ہم ماضی کے گزرے ہوئے واقعات سے درس عبرت لیں اور اپنی اصلاح کر سکیں، اس لیے نہیں کہ اسے وعظ اور تقریر کا موضوع بنادیں۔

واضح رہے کہ ہر معاشرے اور ہر بستی کی اصلاح کے الگ الگ طریقے ہوتے ہیں یہ طریقے وقت اور ماحول کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اس لیے تاریخی قصوں کو محض قصہ کی حیثیت سے بیان کرکے یہ توقع رکھنا کہ اس سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی غیر ممکن ہے۔

تاریخی قصوں کو بیان کرنے سے زیادہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں خود ہمارے سامنے ایسے کتنے واقعات ہیں جنہیں پیش کرکے لوگوں کے لئے عبرت کے پہلو نکالے جا سکتے ہیں اور جن کے ذریعے مستقبل کے خطوط متعین کئے جا سکتے ہیں۔ اگر اس کی صلاحیت آپ کے اندر ہے تو آپ ایک مصلح کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

نفسیاتی اور منطقی علوم سے استفادہ:

منطقی دلائل سے استدلال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ داعی تقریر کے ان اسالیب سے واقف ہو جن کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کو منظم اور مربوط کرسکے کیونکہ ان انسانی علوم کا مطالعہ معلومات کے نئے نئے گوشے فراہم کرتا ہے اور دوسروں کو اپنی سمجھانے میں مد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔

(۴) قرآن کریم کی بہترین تلاوت:

اس کے لئے داعی کی نظر قواعد، لغت، تفسیر، تجوید اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم کی روح پر ہو۔ وہ جملہ انشائیہ اور جملہ خبریہ کے درمیان تمیز کر سکتا ہو۔ کہاں سوال کیا جا رہا ہے اور کہاں کس بات کی تائید کی جارہی ہے اس کو جان سکتا ہو۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو قرآن مجید کی تلاوت تو کرتے ہیں لیکن اس سے انہیں

ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد وہ اسے اور بھی پیچیدہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کہاں وقف کیا جاتا ہے اور کہاں ملا کر پڑھا جاتا ہے وہ اسے کچھ نہیں جانتے۔

احادیث کا بر محل استعمال:

اس سلسلے میں اصطلاحات حدیث سے واقفیت اور غلط سلط روایات سے صحیح احادیث کے انتخاب کا علم بے حد ضروری ہے۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ حدیث کو پوری سند کے ساتھ نقل کر دیا جائے جیسا کہ صحاح ستہ میں کیا گیا ہے یا پھر صرف صحابی رسول کا حوالہ ہی نقل کر دیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دین میں احادیث کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کسی چیز کی حلت وحرمت کا حکم اسی سے مستنبط کیا جاتا ہے، اس لیے اس کی صحت کا پورا اہتمام کرنا چاہیے اور موضوع روایات سے صحیح روایات کو چھانٹنے کا پورا پورا اہتمام کرنا چاہیے"۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ [بخاری: کتاب العلم، مسلم: مقدمہ]

"جس نے جان بوجھ کر ہماری طرف جھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

مجلس کو قابو میں کرنا:

اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ متکلم کا لب ولہجہ اور تقریر کا انداز ایسا ہو کہ عوام اس کی تقریر پوری دل چسپی اور انہماک کے ساتھ سن سکیں۔ شور وہنگامہ بالکل نہ ہو اور حاضرین کو خاموش کرنے کے لئے تلاوت قرآن مجید یا صدر جلسہ یا کسی اور کو حکم صادر کرنے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بالکل ضرورت باقی نہ رہے، مقرر کو ایسا ہونا چاہیے جو تنہا اپنی شخصیت اور اپنی تقریر کے بل پر پوری مجلس کو اپنے کنٹرول میں لے سکے، اس کے لئے بھی مقرر کو کافی مشق اور تقریری لب ولہجہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

آواز کی دروبست:

مقرر کو موقع کی مناسبت سے اپنی آواز کا خیال رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ مخاطب کے ذہن کو بیدار رکھنے یا اس کو تھکا دینے میں آواز کی پستی اور بلندی کا بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آواز نہ تو بہت زیادہ پست ہو کہ سنائی ہی نہ دے اور نہ ہی بہت زیادہ بلند ہو، آواز صرف اس قدر ہونی چاہیے کہ سامعین آسانی سے سن سکیں اور انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دوران تقریر جہاں کہیں آواز کو بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہو وہاں آواز میں گرمی پیدا کرے اور جہاں نرمی اور پستی کی ضرورت ہو وہاں نرم انداز میں گفتگو کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ وہ سامعین کے جذبات خفتہ کو بیدار کر سکے۔ ایسا لب ولہجہ اختیار کرنے سے گریز کرے جو سامعین کے ذہن کو تھکا دینے والا ہو۔

بشارت:

مقرر کو ایسی باتیں سامعین کے سامنے پیش کرنی چاہئیں جسے سن کر سامعین کے چہرے کھل جائیں اور سامعین اچھی توقعات وابستہ کر سکیں۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ نذیر کے ساتھ بشیر بھی ہے اور لوگوں کو خوفزدہ کرنا ہی نہیں بلکہ انہیں مطمئن کرنا بھی اسی کا کام ہے، اس لیے قرآن کریم نے ہر جگہ انذار وتبشیر اور وعدوں اور وعیدوں کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

[الاحزاب: ۳۳/۲۶،۲۵]

" اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر، اور روشن چراغ بنا کر۔"

واضح رہے کہ یہ خوبی صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ قیامت تک ہر اس شخص کو اس خوبی سے متصف ہونا چاہیے جو ان کے اسوہ کو اختیار کرکے لوگوں کو دین کی دعوت دے۔

اَلدُّعَاةُ عُمَّالُ الدِّيْنِ "داعی دین کے خادم ہیں (خدائی فوجدار نہیں ہیں)"

علوم معقولات سے استفادہ:

بہت سے مسلمانوں میں عقلی اور نقلی راستوں کے اختیار کرنے میں سخت کشمکش پائی جاتی ہے۔ حالانکہ دوسرے ادیان کے مقابلے میں ہمارا دین اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ جہاں وہ منقولات کی اتباع لازم ٹھہراتا ہے وہیں معقولات سے استفادہ کو بھی لازم قرار دیتا ہے، اس لیے ایک مسلمان سے سب سے پہلے ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور ایمان بالغیب مثلاً اللہ کا وجود، قیامت، دوزخ، جنت یہ سب چیزیں ہیں جو حواس انسانی کی گرفت سے باہر ہیں۔ البتہ جن چیزوں میں اسلام نے متعین احکام نہیں دیئے ہیں یا وہ چیزیں حواس انسانی کی گرفت میں آتی ہیں اور ان کے ذریعہ کائنات کے اسرار کی نقاب کشائی ہوتی ہے، ان تمام چیزوں کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانیت ایک قدم بھی ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلم نہ تو کوئی ملحد ہوتا ہے جو ہر نامعلوم شے کا انکار کر بیٹھے اور نہ کوئی حیوان ہے جو عقل وذہن سے کام لینا ہی چھوڑ دے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ عقل کو معبود نہیں بناتا، اس سے وہی فیصلے کرواتا ہے جو اس کے شایان شان ہیں۔ عقل کا اصل کام مخلوقات کی حقیقت معلوم کرنا ہے نہ کہ خالق کی حیثیت متعین کرنا۔

گذشتہ بحث کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ داعی کو لوگوں کے ظرف کے مطابق ہی ان سے بات کرنی چاہیے اور ایسے دلائل ان کے سامنے بیان کرنے چاہئیں جن سے لوگ مطمئن ہو سکیں۔ وہ گفتگو جو لوگوں کو مطمئن کر دے اس کی مثال اس کھانے کی سی ہوتی ہے جو جلدی ہضم ہو جاتا ہے اور جسم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

داعی اور خطیب کے لئے ضروری ہے کہ بات کو اس انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرے جو عام فہم ہو اور اس میں کوئی الجھاؤ نہ ہو اور اگر کسی ایسی چیز میں اختلاف کر رہا ہے جس کا تعلق تمام تر ذہن وعقل سے ہی ہے تو اسے لعنت ملامت بھی نہ کرے۔

تلخیص:

تلخیص سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو جسے مقرر کہہ چکا ہے آخر میں

نہایت اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی بیان کر دے۔ یہ طریقہ سامعین کے لئے نہایت ہی نفع بخش ہے، کیونکہ اس سے وہ تمام باتیں جسے وہ کہہ چکا ہے ایک مرتبہ پھر سامعین کے گوش گزار ہو جاتی ہیں، اس سے ان کے علم میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور بھولی ہوئی چیز دوبارہ ذہن میں مستحضر بھی ہو جاتی ہے۔ کسی تقریر کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مقرر کو اس طرح کہنا چاہیے "ہم نے آپ کے سامنے فلاں موضوع پر تقریر کی ہے، اس میں ہم نے یہ باتیں کہی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ اس میں چار نکات نکلتے ہیں نمبر: ۱، نمبر: ۲، نمبر: ۳، نمبر: ۴" پھر سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کر دے۔

تقریر کے بعد:

تقریر ختم کرنے کے بعد پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کس حد تک اس کے نتائج سامعین پر مرتب ہوئے ہیں۔

مصلحین کے متعلق ایک بات بہت مشہور ہے وہ یہ کہ ان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ کلمہ جو ان کے درمیان نقطۂ اتصال کی حیثیت رکھتا ہے ان کے اندر اس کا فقدان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت کے خاطر خواہ اثرات دلوں پر مرتب نہیں ہو پاتے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ہزار ہا ہزار مسجدیں ہیں جن میں ہر ہفتہ یا ہر مہینہ سیکڑوں آدمیوں پر تبلیغ کی جاتی ہے اور انہیں مواعظ حسنہ سے نوازا جاتا ہے اور یہ سب مقرر کی باتوں سے متفق بھی ہوتے ہیں، لیکن بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس پر عمل بھی کرتے ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟؟؟ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ داعی کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ امت مسلمہ کے اندر اتحاد و یگانگت کی روح ختم ہو چکی ہے اور ان کی حیثیت ریت کے منتشر ذرات کے سوا اور کچھ نہیں رہ گئی ہے۔ ان میں کوئی محتاجوں کی چارہ گری کرنے والا اور مظلوموں کی دادرسی کرنے والا نہیں ملتا ہے۔ نہ تو تقریر سے پہلے اور نہ تقریر کے بعد ہی۔

ظالم تقریر سے پہلے بھی ظلم کرتا ہے اور تقریر کے بعد بھی کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ کیا کسی اسلامی سوسائٹی کا مزاج یہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی یہی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان حالات میں امر بالمعروف کے ذریعہ ہی ان

برائیوں کا سد باب کیا جاسکتا ہے جو آج ہمارے معاشرے پر چھا چکی ہیں اور ان غلطیوں کی اصلاح کی جاسکتی ہے جو نفس کی بندگی کی پیداوار ہیں۔

معلوم ہوا کہ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے سے ہم معاشرے کی دوسری گندگیوں کو ختم کر سکتے ہیں اس طرح امر بالمعروف کی حیثیت ڈھال کی ہے اور نہی عن المنکر معاشرے میں پھیلی ہوئی بیماریوں کا علاج ہے۔ ایسے ماحول میں داعی جو طرز عمل اختیار کرتا ہے ان میں سے چند کے نمونے ہم نیچے دے رہے ہیں:

۱: جو مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتے ہیں ان کی خیریت دریافت کرنا ان کے یہاں جانا یا سلام کہلوانا۔

۲: کام کے لوگوں سے جانکاری وتعارف حاصل کرنا۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دعوت کے بارے میں لوگوں کے تاثرات معلوم کئے جائیں اور خود انہیں مقرر سے جواب حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں اور جو لوگ اس سلسلہ میں پیش رفت کریں ان سے واقف ہوا جائے اور ملاقات کے مواقع حاصل کئے جائیں۔ اس طرح ان کے درمیان اخوت کی فضا پیدا ہو گی۔

۳: حسن سلوک..... مثلاً طلبہ کو کورس کی چیزیں خریدنے میں ان کی مدد کرنا یا ان کی نگہبانی کرنا۔ ایک ہی طبقہ کے افراد کے درمیان ازدواجی رشتے استوار کرنا، تحفے تحائف کا تبادلہ، کسی آقا کو اپنے ماتحتوں پر نرمی کی نصیحت، تجارتی معاملات میں صلحاء اور اتقیاء کو ترجیح دینا، اس طرح کے ہر اچھے کام بقدر امکان کرنا۔

۴: نزاعی معاملات کا تصفیہ..... آپس کے اختلافات کو حل کرنے کے لئے کوئی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ یہ کام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں اگرچہ وقت اور مال زیادہ خرچ ہوتے ہیں لیکن دو نفرت کرنے والوں کے درمیان اخوت و محبت پیدا ہوتی ہے۔

۵: منصوبہ بندی..... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل قبیلہ کے درمیان آپس میں بھائی چارگی تو ہوتی ہے لیکن ان کے درمیان کوئی ایسا ربط و تعلق نہیں ہوتا جو اس رشتہ کو استوار کر سکے۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے اور رشتوں میں کمزوری پیدا ہوتی

رہتی ہے لیکن جب کوئی واضح منصوبہ اور سوچا سمجھا پلان ہو گا تو اس سے ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا ایک وسیع میدان فراہم ہو جائے گا اور ان تعلقات کو جلا ملے گی اس طرح لوگوں کے معاشرتی تعلقات خوش گوار اور پر مسرت ہو جائیں گے۔ مسجد، مدرسے، شفاخانے اور ریلیف کمیٹیوں کا قیام اسی ضمن میں آتا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ خود انفرادی اور شخصی حیثیت سے بھی اس میں بہت سے فوائد مضمر ہیں کیونکہ اس سے لوگوں کے آپس کے تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں اور باہمی تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرے منصوبے بنتے رہتے ہیں جو پہلے سے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔

توسیعی لیکچرز:

اس میں کسی متعین موضوع پر اس سے متعلق معلومات ترتیب سے جمع کر دی جاتی ہیں۔ یہ ایک علمی چیز ہوتی ہے جو جوش وجذبات سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ اسے کبھی تو خود مضمون نگار سامعین کو پڑھ کر سناتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا اس کی جگہ پر پڑھتا ہے اور آخر میں سامعین کو سوال وجواب اور بحث ومباحثہ کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس میں مقالہ نگار موضوع پر لکھے ہوئے بنیادی مباحث کو اچھی طرح سے پڑھتا ہے، اس سے دعوت کے سلسلہ میں کئی طرح سے کام لئے جاتے ہیں۔ کبھی کسی مخفی چیز کی وضاحت کی جاتی ہے۔ کبھی حق پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کیا جاتا ہے اور کبھی ان اوہام وخرافات کا پردہ چاک کیا جاتا ہے جو حق پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس میں ان تمام چیزوں کا لحاظ کیا جاتا ہے جن کی پوری تفصیل "تقریروں کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے"

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ لیکچروں میں کچھ اور خوبیاں بھی ہونی چاہئیں جو یہ ہیں:

ا: حوالہ جات صحیح ہوں۔ کیونکہ لیکچرز میں تحقیق اور تنقید کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کے بیشتر اجزاء دوٹوک ہوتے ہیں، اس لیے مقالہ نگار کو چاہیے کہ جن چیزوں کا وہ حوالہ دے رہا ہے اسے ان پر مکمل اعتماد ہو۔

۲: ہلکے پھلکے جملے ہوں۔ اچھا مقالہ پیچیدہ الفاظ اور بھاری بھر کم جملوں سے پاک ہوتا ہے، تصنع سے بھرے ہوئے الفاظ اور طول و طویل جملوں کا استعمال مقالے میں کوئی خوبی پیدا کرنے کے بجائے اس میں عیب پیدا کر دیتا ہے۔

۳: متعین نکات کی پابندی ہونی چاہیے۔ اس کو مرتب کرنے میں مقالہ نگار کو کافی عرق ریزی اور دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ اس میں برجستگی کا کوئی موقع نہیں ہوتا، اس کے برخلاف چن چن کر ایسے الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے جو مدعا کے اظہار میں بالکل واضح ہوں۔

۴: قرآن مجید، احادیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال صحیح صحیح درج کئے جائیں۔

۵: اصل موضوع سے مربوط ہو۔ مقالے کے تمام اجزاء میں ایک مقصدی ربط ہونا چاہیے کیونکہ داعی ایسے موضوعات کا انتخاب ہرگز نہیں کرتا ہے جو محض تفریح کے طور پر ہو اور لوگوں کو تھپک تھپک کر سلادے۔ مقالہ کا مقصد یا تو حق کی مدافعت ہو یا اسلاف کی میراث کی حفاظت ہو یا معروف اور خیر کی طرف رہنمائی ہو۔

۶: مقالہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ بردبار، فراخ دل، خود اعتماد اور عالی ظرف ہو، اپنے مقالے پر اٹھنے والے اعتراض کا نہایت تحمل کے ساتھ جواب دے سکتا ہو۔

بحث ومباحثہ:

گفتگو کبھی مرتب انداز میں ہوتی ہے اور کبھی غیر مرتب انداز میں یعنی کبھی بغیر کسی سابق تیاری کے ہم کسی سے گفتگو کرتے ہیں جیسا کہ عام طور پر انفرادی اور شخصی ملاقاتوں میں ہوتا ہے اور کبھی کبھی مفکرین کے تحت دیئے ہوئے عناوین پر تیاری کرکے گفتگو کرتے ہیں۔

بحث و گفتگو کی ان ہر دو حالتوں میں ہم داعی کو مندرجہ ذیل نصیحتیں کرتے ہیں:

۱: موضوع کی اچھی طرح سے تیاری کریں اور ان تمام دلائل کو اچھی طرح ذہن میں بٹھالیں جن سے ہم اپنی بات اچھی طرح سمجھا سکتے ہوں۔ اس طرح کی گفتگو میں یہ مناسب نہیں ہوتا کہ جب بھی موقع ملے کھڑا ہو کر تقریر شروع کر دے۔ خصوصاً نزاعی موضوعات پر اظہار خیال نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارا کام مثبت انداز

میں دعوت کی اشاعت ہے اور دوسرے مناظرہ باز مقررین کی طرح اختلافات کو ہوا دینا نہیں ہے۔

۲: سوالات کے جواب دینے میں احتیاط ملحوظ رکھیں۔۔۔ چونکہ داعی عوام ہی کا ایک فرد ہوتا ہے اس لیے زندگی کی دوڑ میں اسے ان کا ساتھ بھی لازمی طور پر دینا ہوتا ہے۔ مزید براں اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں وہ لذات دنیوی سے متاثر ہو کر کوئی غلطی تو نہیں کر بیٹھا ہے۔ غلطیوں سے بچنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ سوالات کے جواب دیتے ہوئے صرف نفس سوال سے تعرض کرے، بلا وجہ کی تفصیلات سے گریز کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں حکم لگانے سے پہلے اس کا باریک بینی اور دیدہ ریزی سے مطالعہ ومشاہدہ کرنے کی عادت پڑتی ہے اور اس سے سامعین کے دلوں میں داعی کا احترام بیٹھ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جس چیز میں داعی کا کامل مہارت نہ ہو اس کے حل کرنے کا بیڑا داعی کو نہ اٹھانا چاہیے اور اگر اس کا جواب دینا ضروری ہی ہو تو صرف اس کے بنیادی پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی ضرور کر دے کہ وہ نوعیت مسئلہ کی تفصیلات سے واقف نہیں ہے۔

۳: صلاحیت اور دانشمندی۔۔۔ داعی کے لئے جذبات کا تابع بن کر کسی مقرر سے بحث ومباحثہ اور مجادلہ ومناظرہ پر تل جانا بھی نہایت خطرناک ہے، ویسے تو صاف گوئی نہائے عمدہ چیز ہے لیکن اس کا بھی ایک موقع ہوتا ہے۔ جس کا لحاظ کرنا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ عوامی مجلسوں میں صاف گوئی کا ذرا زیادہ مظاہرہ کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ویسے بھی کسی شخص کی بات کاٹنا نہیں چاہیے تاآنکہ وہ اپنی بات کو ختم کرلے۔ جب وہ اپنی بات ختم کرلے تب آپ اپنی بات کہیں۔

مخاطب کی بات بھی خوب غور اور توجہ سے سننا چاہیے تاکہ اگر اس میں کچھ فائدہ کا پہلو ہو تو اسے آپ حاصل کر سکیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جب ہم گفتگو شروع کرتے ہیں تو مخاطب کی معلومات میں اضافہ نہیں کر پاتے۔ اپنی بات کہنے کے ساتھ

ساتھ مخاطب کی بھی سنیں تاکہ اپنی بات کو اچھی طرح پیش کر سکیں۔
خیال رکھنا چاہیے کہ کسی سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے علم وجذبات کو کنٹرول میں رکھا جائے کیونکہ گفتگو ایک طرح کی جنگ ہوتی ہے جس میں ہر فریق اپنی کامیابی کا خواہاں ہوتا ہے اس لیے جب کبھی کسی سے بحث کا موقع ملے تو مجلس سے اس طرح نہیں اٹھ جانا چاہیے جس سے یہ محسوس ہو کہ آپ دونوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی دیوار حائل ہو گئی ہے۔

۴: احترام اور حسن سلوک..... اس طرح کے مواقع پر آپ کو مخاطب کے سامنے بلند اخلاقی اور نرم دلی کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہیے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے اچھے نام سے مخاطب کریں۔اس کے معیار کو ملحوظ رکھ کر اس سے گفتگو کریں اور احساس دلائیں کہ اس سے مل کر آپ کو بے انتہا مسرت اور خوشی ہوئی ہے۔اختلاف رائے کو آپس کی مودت وخلوص کے بگاڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہم اس کا تذکرہ کر چکے ہیں پھر یہ بھی خیال رہے کہ کچھ اختلافات ایسے ہوتے ہیں جن میں محبت کی چاشنی بھی موجود ہوتی اور بہت سی عداوتیں محض اپنی ذات کے لئے ہوتی ہیں۔

۵: نتیجہ تک پہنچنا..... بحث میں سب سے پہلی خواہش آپ کی یہ ہونی چاہیے کہ آپ حاصل بحث پیش کرنے کی کوشش کریں۔اگر آپ یہ دیکھیں کہ بحث ٹھیک رخ پر چل رہی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کا فرض ہے کہ پوری دانائی سے کام لے کر بحث کو ایسے رخ پر موڑ دیں کہ مخاطب کے سامنے اس کا خلاصہ اور نتیجہ خود بخود آجائے بے فائدہ اور لاحاصل بحثوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ عقل مند وہی لوگ ہوتے ہیں جو نتیجہ بحث تک جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور بحث کے دوران خواہ مخواہ کی باتوں کو جس سے جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو راہ نہیں دیتے۔
اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں:
ہمیں دمشق میں منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ جہاں قرار دادوں کی

تفصیلات پر بحث کرتے ہوئے کافی وقت ضائع ہو گیا۔ جب گفتگو کافی طول کھینچ گئی تو ایک ممبر نے خود ہی ایک کاغذ پر قرار دادوں کے نکات لکھے اور کانفرنس میں شریک تمام حضرات سے ان نکات پر رائیں طلب کیں۔ لوگوں نے جلدی جلدی اپنی آراء کا اظہار کیا اور معمولی تغیر کے ساتھ سب ہی نے اس پر اپنے دستخط کر دیئے۔ اس طرح باہمی اتفاق رائے سے وہ قرارداد منظور ہو گئی اور اگر اتفاق سے ایسا نہ ہوتا تو عشاء کی نماز اور شام کا کھانا سب غارت ہو جاتا۔

گفتگو کے چند نمونے:

ذیل میں ہم ایسی گفتگو کے چند نمونے نقل کر رہے ہیں جن سے اکثر داعیوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک مستشرق نے کسی اسلامی تنظیم کے کچھ افراد سے ملاقات کی۔ اسلام پسند نوجوان اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ مستشرقین کے خفیہ تعلقات ہوتے ہیں اور ان کی بہت سی سرگرمیاں زیر زمین ہی انجام پاتی ہیں۔ مستشرق اور ایک اسلام پسند نوجوان سے درج ذیل گفتگو ہوئی۔

مستشرق: آپ لوگ اس تنظیم کے لئے جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔

نوجوان: جناب کے حُسن ظن کا شکریہ۔

مستشرق: لیکن آپ کی آمدنی تو بہت کم محدود معلوم ہوتی ہے۔

نوجوان: کیا کریں تنظیمی دستور کی حد میں رہ کر ہمیں اپنا کام کرنا پڑتا ہیں۔

مستشرق: کیا آپ کے لئے یہ فائدہ مند نہ ہوگا کہ آپ اپنے ذرائع ووسائل کو وسیع کریں تاکہ آپ کی سرگرمیوں کے لئے وسیع میدان فراہم ہوسکے۔

نوجوان: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بغیر مال کے اضافہ کے ہماری سرگرمیوں کے لئے میدان فراہم ہو جائے۔

مستشرق: آپ لوگ تو صوفی معلوم ہوتے ہیں۔

نوجوان: ہم صرف مسلمان ہیں، ویسے ہم اپنی چادر دیکھ کر ہی پیر پھیلاتے ہیں اس لیے کسی کی محتاجی نہیں رہتی اور مغربی تہذیب کے پروردہ ہمیشہ اپنی حیثیت سے زیادہ کے خواہاں رہتے ہیں اس لیے وہ ہمیشہ محتاج رہتے ہیں۔

دوسری گفتگو: دوسری گفتگو ایک داعی اور ایک ذمہ دار افسر کی ہے۔

افسر: آپ کی یہ دعوت ویسے ہے تو بہت عمدہ ہے، لیکن اپنی جماعت میں صرف ایسے لوگوں ہی کو شامل کیجیے جو کسی امتیازی حیثیت کے حامل ہوں۔

داعی: مثلاً کون سے افراد۔

افسر: جیسے شہر کے معززین، حکومت کے افسران اور قوم کے روساء۔

داعی: ضروری نہیں کہ یہ لوگ کسی قابل امتیاز حیثیت کے حامل بھی ہوں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن سے آپ کو اکثر شکوہ رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے انہیں دعوت بھی دی ہے مگر انہوں نے قبول ہی نہیں کیا۔

افسر: تب تو آپ لوگوں کو چاہئے کہ ان نچلے طبقہ کے لوگوں سے اپنے ہاتھ کھینچ لیں جن کے ذریعہ خود آپ کا وقار ہی مجروح ہو رہا ہے۔

داعی: (مسکراتے ہوئے) جناب ہماری تنظیم کی مثال کسی کارخانے کے اس حصے کی ہے۔ جہاں چیزوں کی اصلاح کی جاتی ہے یا اس کسوٹی کی ہے جس میں کھرے کھوٹے کی پرکھ ہوتی ہے اور جنہیں آپ ذلیل کہہ رہے ہیں وہی اس کارخانے کے اصل جوہر ہیں اگر ہم انہیں ہی نکال دیں تو یہ تنظیم اپنی اساس ہی کھو بیٹھے گی۔

تیسری گفتگو:

ایک داعی سے کہا گیا کہ آپ کی یہ دعوت اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک آپ کوئی ایسا شفا خانہ نہ کھول لیں جہاں بیمار عوام اپنا علاج کر سکیں داعی نے جواب دیا فرض کر لیجیے کہ پوری قوم جسمانی طور پر صحت مند اور توانا ہو جائے تو اس کے دوسرے مسائل بھی حل ہو جائیں گے؟ انہوں نے کہا نہیں، تعلیم کی نشر واشاعت بھی ضروری ہے، داعی نے جواب دیا فرض کر لیجیے کہ اگر تمام لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں جیسے سوئزرلینڈ کے لوگ ہیں تو کیا اس سے ان کی مشکلات حل ہو جائیں گی؟ انہوں نے کہا اکثر وبیشتر تو حل ہو جائیں گی بقیہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ایسی کمیٹیاں بنائی جائیں جو لوگوں کو ایک دوسرے پر احسان کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تعلیم دیں۔ داعی نے جواب دیا کیا آپ کا خیال ہے کہ اگر

لوگوں میں تعلیم عام ہو جائے لوگ مال دار ہو جائیں جسمانی لحاظ سے کافی ہٹے کٹے اور صحت مند ہو جائیں تو کیا وہ اپنے دشمن کے غلبہ سے نجات پالیں گے۔

انہوں نے کہا جی ہاں، مجھے اس کا پورا یقین ہے، داعی نے جواب دیا نہیں میرے بھائی اس پسماندہ اور بچھڑی ہوئی قوم کو ترقی یافتہ اور اس کے مُردہ جسم میں رُوح ڈالنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہی طریقہ جس کی تعلیم انبیاء اور رسولوں نے دی ہے یہ کل تین چیزیں ہیں۔

۱۔ لوگوں تک دین کی دعوت پہنچانا، صحیح شکل میں ان تک اسلامی تعلیمات پہنچانا۔

۲۔ لوگوں کے اندر اس کے لئے خلوص پیدا کرنا اور اس کے مطابق ان کی تربیت کرنا۔

۳۔ اس کی بازیابی کے لئے ان کے ساتھ تعاون کرنا۔

یہی وہ اہم عناصر ہیں جنہیں اختیار کرکے ہم خدا کی نصرت کے مستحق ہو سکتے، اور دشمنوں پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی گفتگو:

دو نوجوان جن کا تعلق دو مخالف پارٹیوں سے تھا آپس میں جھگڑ پڑے ایک نے دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ تمہاری پارٹی کے صدر نے فلاں طریقہ سے دس ہزار ڈالر غبن کر لئے ہیں۔ دوسرے نے کہا کیا حرج ہے؟ تمہاری پارٹی کے لیڈر نے بھی تو بیس ہزار غبن کئے ہیں۔ پہلے نے پھر کہا یہ سراسر افترء اور بہتان ہے۔ کیا تم اسے ثابت کر سکتے ہو دوسرے نے کہا تمہاری بات بھی تو افترء اور بہتان ہی ہے۔ کیا تم اسے ثابت کر سکو گے؟ اس طرح یہ بحث ختم ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوئی قابل ذکر گفتگو نہیں ہے بنیادوں میں اختلاف ضرور ہے لیکن گفتگو کی یہ ٹیکنیک بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ داعی کو ہمیشہ وار سہنا ہی نہیں بلکہ وار کرنا بھی چاہئے۔ یہ کیا کہ لوگ الزام تراشی برابر کئے جائیں اور ہم صرف انکار کرتے رہیں۔ آخر کب تک انکار کریں گے کبھی کبھی خود حملہ کرنا بھی بہترین دفاع ہوتا ہے۔

پانچویں گفتگو:

ایک صاحب نے اسلامی تنظیم کے کچھ افراد سے سوال کیا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ واعظ ہیں؟ تاجر ہیں؟ فوجی ہیں؟ سیاسی قائد ہیں؟ آخر کیا کیا ہیں؟

داعی نے جواب دیا اس میں تعجب کی کیا بات ہے آپ خود بھی تو کاشتکار ہیں، دین پسند ہیں، سیاست داں ہیں، تاجر ہیں، اور پتہ نہیں کیا کیا ہوں گے۔ انہوں نے کہا میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کوئی ایک ہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جسے عوام جان سکیں۔ داعی نے جواب دیا۔ بھائی ہم نے تو صرف ایک ہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ ہی طریقہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ وہ خود بھی تو ایک ہی وقت میں ایک بلند پایہ ہادی ورہنما بھی تھے، ماہر سیاست بھی تھے اور معلم اخلاق بھی اس سے پہلے وہ ایک تاجر اور چرواہے تھے۔ انہوں نے کہا بات تو ویسے آپ کی ٹھیک ہے لیکن دل کو لگتی نہیں۔ داعی نے کہا۔ میرے بھائی دل میں نہ سمانے کی جہاں تک بات ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک ایسی فکر سے متاثر ہیں جو ایک غیر اسلامی فکر ہے، آپ کے ذہن میں یہ بات گھسادی گئی ہے کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں حالانکہ اگر سیاست عملی زندگی کا نام ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ تمام لوگوں کے لئے جائز ہے تو صرف دین پسندوں ہی کے لئے ناجائز کیوں ہے۔

چھٹی گفتگو:

ایک داعی اپنی ایک رشتہ دار عورت کے پاس گئے، خاتون نے ان سے اپنے شوہر کے متعلق شکایت کی اور بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے دوستوں کی محفلوں میں شریک ہوں اور اپنا سر اور دونوں بازوں کھلے رکھوں، انہوں نے شوہر سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ شوہر نے کہا۔ جس طرح اور لوگ کرتے ہیں ویسا ہی میں بھی کرنا چاہتا ہوں اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ داعی نے ان سے پوچھا یہ بتایئے کہ لوگوں کی بات ماننی چاہئے یا جو بات حق ہے اس کو ماننا چاہئے۔ شوہر نے جواب دیا کہ جسے عام طور پر لوگ اختیار کرلیں وہی تو حق ہوتا ہے۔ داعی نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ لوگ چوریاں کرتے ہیں آپ بھی چوری کریں تو اپنی اسی دلیل کو استعمال کرکے آپ سزا سے بچ جائیں گے۔ اس پر شوہر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ آپ نے اپنی

گفتگو میں قَالَ اللہ اور قَالَ الرَّسُوْلُ ﷺ کا حوالہ نہیں دیا جیسا کہ عام طور پر واعظین کرتے ہیں۔ داعی نے کہا اس کا موقع اگلی ملاقات میں انشاء اللہ آئے گا۔

ساتویں گفتگو:

ایک مرتبہ کسی مجلس میں ایک نوجوان نے ایک داعی سے مندرجہ ذیل سوال کیا۔ اُستاد کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ آپ نے اپنی داڑھی بڑھنے کے لئے کیوں چھوڑ دی ہے۔ داعی نے بجائے جواب دینے کے خود ہی سوال کر لیا، اور آپ نے اسے مونڈوایا کیوں ہے؟

نوجوان: میں اپنی مرضی کا آپ مالک ہوں۔

داعی: اور میں بھی کسی کا پابند نہیں ہوں۔

نوجوان: پھر بھی داڑھی بڑھنے کے لئے چھوڑ دینا کچھ بھونڈا سا لگتا ہے۔

داعی: ہر گز نہیں بھونڈا پن تو اس کے صاف کر دینے میں ہے۔ میں نے تو اُسے بڑھنے کے لئے چھوڑ دیا ہے جو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ البتہ آپ سے اس کے صاف کروا دینے کی بابت ضرور کچھ پوچھنا چاہوں گا۔

نوجوان: جسم کے تمام بالوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑا نہیں دیا جاتا کچھ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا کٹوانا ضروری ہے۔

داعی: مثلاً۔

نوجوان: صرف سر کے بال ایسے ہیں جنھیں بڑھنے کے لئے چھوڑا جاتا ہے بقیہ کو صاف کر دیا جاتا ہے۔

داعی: تو ٹھیک ہے میں یہی چاہتا ہوں کہ میرا چہرہ میرے سر ہی کی طرح ہو۔ اس پر حاضرین ہنس پڑے اور نوجوان شرمندہ ہو کر لوٹ گیا۔

باب:۹

دعوت کتابوں سے

تصنیف وتالیف:

دنیا میں کتابوں کی کمی نہیں ہے ہر گھر میں بلکہ ایک چھوٹے سے مکتب میں بھی کتابوں کی لائبریری موجود ہوتی ہے۔ چھاپہ خانہ کی حیرت انگیز ایجاد، کاغذ کی صنعت نیز طباعت کی سہولت اور کمپیوٹر کی ایجاد نے اس فن کو مزید ترقی دی ہے۔ وہ دور ختم ہو چکا جب موم پر لکھا جاتا تھا یا کاغذ سازی کا کام محدود پیمانے پر ہوتا تھا۔ یہ ایک ترقی یافتہ دور ہے، آج روزانہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں کتابیں پریس سے نکلتی ہیں۔ کتابوں کے اس انبار میں فحش لٹریچر اور جنسیاتی رسائل کا نمبر بلا اختلاف آگے ہیں۔ اس کے بعد روزناموں ہفت روزوں اور ماہناموں کا نمبر ہے۔ اس کے بعد افسانوں کہانیوں نیز جاسوسی کتابوں کی باری آتی ہے اور سب سے آخری مرحلہ میں دینی کتابیں ہیں۔

ہر اس مادہ پرست اور سیکولر معاشرے میں کتابوں کی یہی منطقی ترتیب ہے۔ جسے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا..... بلا شبہ دور جدید کی یہ فکری غذا بڑے اور چھوٹے کے لئے یکساں طور پر ضرر رساں ہے۔

موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے دو چیزیں داعیان دین کے لئے نہایت اہم ہیں:

۱۔ موجودہ وسائل وذرائع کو بہتر ڈھنگ سے استعمال کریں جن کے ذریعہ ہم شخصیت کی تعمیر کر سکیں اور نئی نسل کی بہتر ڈھنگ سے تربیت کر سکیں۔

۲۔ کتابوں کے اس بازار میں جو ظاہری خامیاں ہیں ان کی اصلاح کریں۔

تالیف کتب کے دو پہلو:

۱۔ ضخیم اور مفید کتابوں کی تلخیص کرنا۔ ان کو ابواب میں تقسیم کرکے بہتر انداز میں ترتیب دے کر دوبارہ ان کی طباعت کروانا تاکہ بے ساختہ اس کو پڑھ لینے کو جی چاہے۔

۲۔ ایسی کتابیں مرتب کرنا جن میں صحت مند اور مفید معلومات کو اس دور جدید کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہو جو علمی اعتبار سے تو نہایت ترقی یافتہ ہے لیکن تہذیب اور روحانیت کے اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔

موجودہ مذہبی کتابوں کی خامیاں:

کتابوں کی دنیا میں آج کل ایسی لاتعداد کتابیں پائی جاتی ہیں جن کا موضوع مذہبی اور دینی ہے، لیکن جب ہم ان پر نظر دوڑاتے ہیں تو بہت کم کتابیں ایسی نظر آتی ہیں جو مندرجہ ذیل خامیوں سے پاک ہوں۔

تکرار:

چونکہ کتابوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا اس لیے جس شخص کے جی میں جو آتا ہے لکھ جاتا ہے۔

علمی معیار کی پستی:

فن تصنیف سے عدم واقفیت اور صحیح مطالعہ کا فقدان (یعنی کمپیوٹر کی ایجاد نے ایسے مصنفین بھی پیدا کر دیئے ہیں جو فن تصنیف سے یکسر لاعلم ہیں اور ان کا مطالعہ بھی وسیع نہیں ہوتا۔ بس جس موضوع پر دل میں جو آیا پنسل سے لکھ کر کمپیوٹر میں دے دیا اور اگلے دن اس کا پرنٹ حاصل کرکے مصنف بن گئے۔ یوں کمپیوٹر کی ایجاد نے بہت سے نام نہاد مصنفین پیدا کر دیئے ہیں۔

طباعت کی خامیاں:

مثلاً یہ کہ حروف مٹے ہوتے ہیں، غلطیوں کی کثرت ہوتی ہے اور ترتیب کا فقدان ہوتا ہے۔

ناقص موضوعات:

مطلوبہ بحث کی کمی مثلاً دین کا زندگی سے ربط یا باطل افکار و نظریات کا علمی مطالعہ وغیرہ۔

تصنیف وتالیف کی اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے ان لوگوں کو جو دعوت اسلامی کے احیاء ونفاذ کے لئے انفرادی یا اجتماعی طور پر جدوجہد کر رہے ہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ

وہ بڑے پیمانہ پر ایک تحقیقی و تصنیفی بورڈ تشکیل دیں جس کا کام اسلامی کتابوں کی اشاعت ہو اور بلا معاوضہ ان کا اشتہار ہو بشرطیکہ مقامی افراد کا اس پر تسلط نہ ہو اور کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کے لئے متعینہ فیس بھی دے دی جائے جیسے نظر ثانی کرانے کا معاوضہ وغیرہ، اس طریقے سے مکتبوں کو یہ تاکید کر دی جائے کہ وہ اس کمیٹی کا احترام کریں اور اپنی کتابوں پر اس کمیٹی کا نام دیں تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ عوام کا اعتماد حاصل ہو سکے۔ نیز اس کمیٹی کی یہ بھی ذمہ داری ہو گی کہ جو مسودات شائع کرنے کے لئے اس کے پاس آئیں وہ انہیں اچھی طرح دیکھے، پھر بھیجنے والے کے پاس اپنی رائے یا تبصرہ بھیج دے۔ اس میں وہ اس طرح کی باتیں لکھے:

- اس موضوع پر فلاں فلاں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اور فلاں کتاب کا شائع کرنا اس کے شائع کرنے سے بہتر ہے۔
- یا یہ کہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نئی ہے، اشاعت کی مستحق ہے مناسب ہوتا اگر آپ اس موضوع پر اس طرح اسی طرز پر اظہار خیال فرماتے۔
- یا یہ کہ اس میں درج ذیل ابواب کا اضافہ ضروری ہے اور اس کے بعد والوں کی تفصیلات کاتذکرہ کر دے یا یہ کہ فلاں ابواب کو حذف کر دینا چاہیے اور اس کی فہرست دے دے۔
- یا یہ کہے کہ اس کا سائز چھوٹا ہو، یا اتنا بڑھا دیا جائے وغیرہ

اس سے توقع ہے کہ کتابوں کی خامیاں جو اکثر و بیشتر ہمارے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں وہ دور ہو جائیں گی اور قابل اعتماد لکھنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہو گی۔ اور کبھی کبھی تو اس سے اور بھی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی ناکامی کا بھی سامنا کرنا پڑے، لیکن اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیے کیونکہ عمل پیہم ہی کامیابیوں کا ضامن ہے۔

داعی اور تصنیف وتالیف:

اس میں شک نہیں کہ دینی موضوعات پر مشتمل تحریکی و دعوتی کتابوں کا جو خلاء ہے اس کا پُر ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میدان وسیع اور کھلا ہوا ہے ضرورت صرف صبر اور احتیاط کی ہے۔

اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دین میں گہری بصیرت حاصل کریں

اور کسی موضوع پر لکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کریں کہ ہم اس میں ایسا مواد اکٹھا کریں جسے اس سے پہلے کسی اور نے نہ کیا ہو۔کتاب کو بازار میں لانے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر ہم اپنے علماء اور محققین کے نقطہ ہائے نظر کو بھی جان لیں تاکہ ہمیں یا ہماری اس کتاب کو نکتہ چین حضرات اور ارباب اقتدار کی جانب سے تنقید واعتراضات کا ہدف نہ بنایا جاسکے۔اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم تصنیف وتالیف میں ایسا مواد اکٹھا کریں جو دعوتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں معاون ثابت ہو، اس کے ساتھ ساتھ عام فہم ہو۔ معلومات سے پُر ہو اور فہم وتدبر کی صلاحیت بھی پیدا کرسکے۔

کوئی چیز لکھتے ہوئے مندرجہ بالا چیزوں کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے اور اگر کوئی شخص تصنیف وتالیف کے کاموں میں مہارت نہیں رکھتا یا اسے فرصت ہی نہیں مل پاتی تو اسے چاہیے کہ جو نئی بات یا اسکیم اس کے ذہن میں ہو وہ دوسرے شخص کو بتادے جن مقالات یا کتابوں سے رہنمائی مل سکتی ہو اس کی بھی نشان دہی کر دے یا جن چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے اس کی بھی وضاحت کر دے..... انشاء اللہ اس کی نیت کا ثواب اسے مل کر رہے گا۔

الغرض داعی حضرات کو چاہیے کہ وہ اسلام، عقائد صحیحہ، توحید وسنت اور مختلف دینی موضوعات پر مستند کتابوں کے ذریعے بھی دعوت کا کام جاری رکھے۔ اپنے حلقہ احباب کو کتابوں کا مطالعہ کراتے رہیں اور اس کے لیے ایک ترتیب وضع کریں۔

صحافت:

فن صحافت کی اہمیت میں عالمی پیمانے پر روز بروز اضافہ ہو رہا ہے خصوصاً وہ ممالک جنہیں فکر وعمل کی پوری آزادی ہے وہ اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ادیب کو اگر صحافت چھوڑ دینے کے بدلے میں منصب وزارت دی جارہی ہو تو وہ اسے لات مار دے گا لیکن ایک وزیر ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک کامیاب صحافی پوری قوم بلکہ کبھی کبھی تو دوسری اقوام کی بھی قیادت کرتا ہے جبکہ ایک وزیر صرف اپنی حدود میں ہی کام کرسکتا ہے۔

کامیاب داعی اس کو نہیں کہتے جس کے بدن پر جبہ اور سر پر اونچی دستار ہو اور مسجد

میں کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ نماز فرض ہے۔ کامیاب داعی اسے بھی نہیں کہتے جو منبر پر کھڑا ہو کر مستضعفین کے سامنے دین کے سخت احکام کی وضاحت کرے اور ان کے آنسوؤں کا خراج حاصل کرے، اس سے ان کی کمزوری اور بڑھ جاتی ہے۔ کامیاب داعی کہلانے کا وہی شخص مستحق ہو سکتا ہے جو عقل سلیم سے کام لے کر لوگوں کے سامنے بقدر استطاعت دین کی تبلیغ کرے نیز ان کے اندر اعلیٰ سیرت و کردار پیدا کرے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ آج منبر و محراب پر اکثر ایسے لوگ قابض ہیں جنہیں نہ تو علم سے کوئی مطلب ہوتا ہے اور نہ عمل سے۔ داعیان دین کے اوپر فرض ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں اور ایسے بن جائیں کہ لوگوں کے اندر آپ سے آپ ان کے لئے جگہ پیدا ہوتا کہ وہ لوگوں کے اندر اپنی بات اچھی طرح پھیلا سکیں۔

صحافتی مقالے:

یہاں فن مقالہ کی تفصیلات پر روشنی ڈالنے کی گنجائش نہیں ہے، موضوع کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ اور کافی مشق وممارست نیز اس فن کے ماہرین کی نگرانی اچھے مقالہ کی شرائط میں سے ہیں۔ نیز مقالہ نگار کو اپنے مقالہ میں ایسا رخ اختیار کرنا چاہیے جو اسے دوسرے مقالوں سے ممتاز کردے۔ مقالہ میں درج ذیل چیزوں کا لحاظ کرنے ہی سے امتیاز پیدا ہوتا ہے:

ادب فروشوں سے ممتاز ہو:

جو تلاش کرتے رہتے ہیں کہ بازار میں کس چیز کا چلن اور رجحان عام ہے کیا چیز لوگوں کے لئے عجیب وغریب ہو سکتی ہے، تجارتی نقطہ نظر سے کس چیز میں فائدہ ہے۔ وہ کسی دینی مصلحت، اصلاحی نقطہ نظر اور اخلاقی برتری کا قطعاً لحاظ نہیں کرتے۔

پیشہ وارانہ اور جامد وعظوں سے پرہیز:

وعظ کے اجزاء باہم مربوط ہوں، زندگی کے کسی متعین موضوع پر گفتگو کی گئی ہو۔ لوگوں کے احساسات وخیالات میں ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہو اور اس سلسلہ میں ان کے جذبات کا بھی لحاظ ہو۔

عام طریقوں سے جدا یعنی یہ کہ عقل و نقل کے دلائل سے مزین ہو، ایسا نہ ہو کہ

صرف معقولات یا صرف منقولات ہی سے استدلال کیا گیا ہو۔ کیونکہ ہمارا دین عقل کا بھی احترام کرتا ہے بشرطیکہ اس کو الٰہ نہ بنا دیا جائے اور منقولات کو بھی لیتا ہے بشرطیکہ اس کو اختیار کرنے میں کمال درجہ بصیرت وبصارت سے کام لیا گیا ہو۔

موضوع کا انتخاب:

داعی کو ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں قارئین کی ضرورتوں کا لحاظ کیا گیا ہو۔ زندگی کے مسائل سے بحث کی گئی ہو، عوام میں پھیلی ہوئی بدعات وخرافات کی اصلاح کی گئی ہو۔ عبارتوں میں ربط ہو، اسلوب دل کش ہو، لہجہ میں آمد ہی آمد ہو اور لوگوں سے ایسی چیز کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو جس کی تکمیل لوگوں کے لئے دشوار ہو۔

اگر کسی مقالے میں مندرجہ بالا خصوصیات موجود ہوں تو ایسا مقالہ قارئین پر اپنا اثر ڈالے گا اور لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہوں گے۔

صحافت کے میدان میں آنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسائل وجرائد جن کے بارے میں عام خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ غیر معیاری ہیں، ان کے ساتھ بھی کام کیا جا سکتا ہے، کیونکہ عیب ان رسائل میں نہیں ہوتا بلکہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس میں کام کرتے ہیں۔ صحافت تو ایک آلہ ہے۔ اسے وسائل وذرائع چاہئیں۔ اگر آپ کا مقالہ صحت مند قدروں کا حامل ہے، موضوع مناسب ہے اور مواد بہتر ہے تو اس کی اشاعت کے متعدد مواقع مل سکتے ہیں اور ایک کامیابی دوسری کامیابی کی ضامن بنے گی۔ ٹیلی ویژن اور ایسے دوسرے بڑے بڑے آلات نشر واشاعت اس کے سامنے ہیچ ہو جائیں گے کیونکہ بہترین چیزیں پیش کرنے والا یقیناً کامیاب ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ ایک مرتبہ کی ناکامی دوسری کوشش کرنے سے ہی روک دے۔ کوشش برابر کرتے رہنا چاہیے کیونکہ جب عزم صادق ہوگا تو منزل کے نشانات ابھریں گے۔

تنقید:

یہاں تنقید سے ہماری مراد ادبی تنقید نہیں ہے۔ اس کی اہمیت بھی اپنی جگہ پر مسلم

ہے۔ کیونکہ یہ بلند پایہ علمی معیار کی چیز ہوتی ہے اور ایک داعی کے پاس اس طرح کی چیزوں میں لگنے کا وقت نہیں ہوتا۔

یہاں تنقید نگاری سے ہمارا مقصد ان کتابوں کا جواب دینا ہے جن میں اسلامی قدروں کو غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہو۔ چاہے اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو یا احوال ومعاملات سے ہو۔ ہر مسلمان کے لئے جو نہی عن المنکر کو اپنا فریضہ حیات سمجھتا ہو ضروری ہے کہ وہ ان جاہلوں اور حق سے منحرف لوگوں کے جوابات لکھے اور جہاں کہیں بھی اس قسم کی کوئی چیز ملے فوراً قلم کاغذ سنبھال لے اور اس کا جواب لکھ ڈالے اور ان چیزوں کو ایسے رسائل میں چھپنے کے لئے بھیجے جن سے توقع ہو کہ وہ اس طرح کے مضامین چھاپ دیں گے۔ اگر اس قسم کے رسائل کم ہوں تو اپنے رسالہ ہی میں چھاپے البتہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ چاہے تو اپنے نام کی وضاحت کرے یا نہ کرے، اہمیت صرف اس چیز کی ہے کہ غلطی کرنے والے کے سامنے اس کی غلطی واضح ہو جائے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی سے بچ سکیں، ورنہ مقلب القلوب تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

بالکل خاموش ہو جانے کا دوسرا نام موت ہے، اس لیے ان لوگوں پر اعتماد کرنا جو دین میں گہری بصیرت رکھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں البتہ بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جانا یہ کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔

اگر آپ اپنے اندر جواب لکھنے کی قدرت نہیں پاتے تو دوسرے علماء فن اور خاص خاص لوگوں سے گذارش کیجیے کہ وہ اس کا جواب دیں اگر آپ نے اتنا ہی کر لیا تو گویا آپ قابل معافی ہوں گے۔

کسی مسلمان کا کسی منکر کو دیکھ کر خاموش ہو جانا اسلام دشمنوں کے لئے راستہ کھول دیتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی عمارت منہدم کرتے رہیں انہیں اس کی کچھ پرواہ نہیں، حالانکہ ہمارے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی عمارت کو منہدم کیا جائے اور ہم محض تماشائی بنے دیکھتے رہیں۔

رسائل وخطوط:

رسالہ کبھی تو کسی متعین موضوع پر ایک کتابچہ ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص دوسرے کو خطاب کرکے کچھ لکھتا ہے اس کو خط کہتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک بہترین فن ہے اس کی اہمیت تو اس قدر ہے کہ یہ مفادات کے حصول میں، موت کے وقت، غلامی سے آزادی کے لئے اور بہت سے اہم معاملات میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔

پچھلی صدیوں میں اس فن کی خاص اہمیت رہی ہے، حتی کہ کامیاب رسائل کے لکھنے والوں کو منصب وزارت بھی ملا ہے۔ تھوڑی سی کوشش اور مشق کے بعد ہم چھوٹے موٹے رسائل بہتر انداز میں مرتب کر سکتے ہیں۔ اس طرح دوسروں کے خطوط کے جواب بھی نہایت اچھے ڈھنگ سے دے سکتے ہیں۔ کیونکہ خطوط کا جواب نہ دینا مناسب نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

" تمہارا اپنے بھائی کو خط لکھنا گویا اس سے ملاقات کرنا ہے تو اس سے ملاقات کو خوش گوار بناؤ"۔

کسی کو خط لکھتے ہوئے درج ذیل چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے:

- صحت وصفائی کا اہتمام اور بقدر ضرورت کاغذ کا استعمال کیونکہ یہ چیزیں ذوق کی پاکیزگی اور نفاست پسندی کی غمازی کرتی ہیں۔
- بھیجنے والے کا نام اور پورا پتہ مع تاریخ پوری وضاحت کے ساتھ درج ہونا چاہیے موضوع کی ترتیب بہتر ہونی چاہیے، اس میں کسی قسم کا ابہام، الجھاؤ اور پیچیدگی نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اس طرح کی تحریروں کو سمجھنے کے لئے کافی محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اس لیے براہ کرم قاری کو اس زحمت سے معاف رکھیں۔
- ملفوف کو کافی اہتمام سے سپرد ڈاک کیجیے مرسل اور مرسل الیہ کا پورا پتہ صاف لکھئے۔ اگر آپ کسی کے خط کا جواب دے رہے ہوں تو ان چیزوں کا بھی لحاظ کرنا چاہیے۔
- خط ملنے کی اطلاع تاریخ کے ساتھ۔ اگر جواب دینے میں تاخیر ہو گئی ہو تو اس کی معذرت بھی کر دینی چاہیے۔

- مرسل کے پوچھے گئے ہر سوال کا جواب لکھئے بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ جس سوال کا جواب دے رہے ہوں اس کا حوالہ بھی دے دیجیے۔
- اپنی غلطی کے اعتراف میں بالکل جھجک محسوس مت کیجیے۔ غلطی کی اصلاح کرنے والے افراد کا شکریہ ادا کیجیے۔

بعض علماء کے خطوط ہم نے دیکھے ہیں وہ جب کسی کو خط لکھتے ہیں تو کافی اہتمام کرتے ہیں جب وہ خط لکھتے ہیں تو ان کے اہتمام کا عالم یہ ہوتا ہے گویا وہ کوئی کتاب تصنیف کرنے جا رہے ہیں۔ ان علماء میں مصر کے ایک جلیل القدر عالم نیز شام کے شیخ محمد الحامد کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کے خطوط بارہا دیکھنے کا موقع ملا ہے ایک بھی خط ہمیں ایسا نہیں ملا جو احکام شریعت کی تفہیم نیز لوگوں کے درمیان مروجہ غلطیوں کی اصلاح سے خالی رہا ہو۔ وہ لوگوں کے ذہن میں پیدا شدہ سوالات کے جوابات دیتے تھے پھر کوئی قصہ یا نکتہ اس انداز سے بیان فرماتے کہ اس خط کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑتا۔ پھر آخر میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے خط ختم کر دیتے۔ اس طرح کے خطوط کے چند نمونے نیچے نقل کئے جا رہے ہیں:

حسن ابن وہبؒ، ابن اسحاقؒ کے لڑکے کی موت پر تعزیت کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھتے ہیں:

" امیر محترم خود دین و شریعت کے واقف کار ہیں اس لیے نصیحت کی ضرورت نہیں اور دنیاوی معاملات میں سب سے آگے ہیں کیونکہ آپ اسی کے لئے پیدا ہی کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں آپ کا اور آپ کے بیٹے کا حامی و مددگار ہو۔" والسلام

یہی عالم دین اپنا ایک حق طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" مجھے تقاضے کی زحمتوں سے معاف رکھیے کیونکہ میں بار بار آپ سے تقاضہ کرنا نہیں چاہتا اور اس کی ادائیگی میں جلدی کیجیے، کیونکہ کوئی دوسرا آپ کے بعد اس حق کو پورا نہیں کرے گا جس سے آپ کی تلافی ہو سکے۔"

یحییٰ ابن خالد قید خانہ سے ہارون رشید کو لکھتے ہیں:

"امیر المؤمنین! اگر میرا گناہ خفیہ ہے تو اس کی سزا عام نہ کیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

مالک ابن المنذر اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہیں:

" میرے بچو! میں زندگی کی ۱۶۰ بہاریں دیکھ چکا ہوں، اپنی زندگی میں میں نے کسی خائن سے ہاتھ نہیں ملایا، کسی بدکار سے بدکار عورت نے بھی میرے سامنے سر سے دوپٹہ نہیں اٹھایا، میں نے اپنے راز سے کسی دوست کو بھی آگاہ نہیں کیا، میں شعیب علیہ السلام نبی کے دین کا پیرو ہوں، میرے اور اسد ابن خزیمہ کے علاوہ اور کوئی بھی اس کا متبع نہیں ہے۔ میری وصیت یاد رکھو! عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔"

داعی کو متروک الفاظ کا سہارا نہیں لینا چاہیے اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لئے وہ شیریں اور آسان الفاظ کا انتخاب کرے۔

علمی و تحقیقی رسالے:

علوم وفنون کی نشرواشاعت میں ایسے رسائل کا ایک ممتاز مقام رہا ہے۔ دعوتی کام کے لئے یہ رسائل بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں، اس میں بہت سے فوائد ہیں۔ بات کو مختصر مگر پروقار طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس میں طویل بحثوں کے نتائج، تجربات کا نچوڑ اور دوسری بہت سی کارآمد چیزیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے داعی ہیں جنہیں تحریکی کاموں ہی سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ کوئی علمی کام کر سکیں تو وہ اپنے مختصر اوقات میں سے بھی کچھ وقت نکال کر اس طرح کے رسائل لکھتے ہیں۔

جب شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ کو قید کیا گیا تو وہ اور زیادہ لکھنے لگے اس پر انہیں کاغذ اور قلم بھی دینا بند کر دیا گیا تو انہوں نے کوئلوں کے ٹکڑوں سے لکھنا شروع کیا، جس کا پتہ ان کی وفات کے بعد چلا کیونکہ اس طرح کے متعدد رسائل ان کی وفات کے بعد ان کے ترکہ میں ملے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثالی داعی ہر حال میں دعوت کے کام میں مشغول رہتا ہے اور اپنا ہر ہر لمحہ دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت پر نظر رکھیے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ۔ [مائدہ:۶۷/۲۷]

"اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا

ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔"

ٹیپ ریکارڈنگ:

موجودہ دور میں کچھ ایسی نادر الوجود چیزیں ایجاد ہوئی ہیں جن سے دعوت دین کے سلسلے میں کافی مدد لی جاسکتی ہے۔ مختلف پروگراموں کے کیسٹ دنیا کی بیشتر لائبریریوں کتب خانوں اور تعلیمی اداروں میں پائے جاتے ہیں، جن سے معذور، نابینا اور تھکے ماندے نیز مصروف افراد استفادہ کرتے ہیں۔

دور جدید کی ایجادات، ٹیپ کی سہولت اور نسخوں کے اضافہ کرنے میں کافی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بات حد درجہ آسان ہو گئی ہے کہ قرآن کریم بہترین تلاوت کے ساتھ ٹیپ کے فیتوں میں محفوظ کر دیا جائے جسے جہاں چاہیں آسانی سے بھیج سکتے ہیں۔

ایک کتب خانہ میں ہم نے ایک ملازم کو دیکھا کہ وہ ہر آنے والے مہمان سے اس کے ملک کے حالات پر ہونے والی گفتگو کو ریکارڈ کر لیتا کیونکہ اخبارات ورسائل، دیگر وسائل نشرواشاعت اور خبر رساں ایجنسیاں ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔

ایک داعی ٹیپ ریکارڈ سے اتنا فائدہ ضرور حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے قرآن کریم کی کچھ سورتیں ٹیپ کرے اور بعض تقریروں اور مذاکروں کو ٹیپ کرکے انہیں دوسرے مقامات پر بھیج دے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ بہت سے لوگ قیمتی نصیحتوں، تجاویز اور سیمناروں کو ٹیپ کر لیتے ہیں اور حسب موقع اسے سنتے رہتے ہیں اور یہ چیز بہت عام ہو چکی ہے۔

ہم نے اس مختصر سی بحث میں ٹیپ ریکارڈ کے فوائد کی طرف کچھ اشارے کر دیئے ہیں اب یہ قارئین کے اوپر ہے کہ وہ اسے جن مفید کاموں میں چاہیں استعمال کریں۔ کتاب کی طرح داعی حضرات کیسٹوں اور سی ڈیز کے ذریعے بھی اپنی دعوت عام کر سکتا ہے۔ اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔

باب:۱۰

دعوت.....کردار سے

داعی کا کردار:

صوفی کی طریقت میں صرف مستی احوال
ملا کی شریعت میں صرف مستی گفتار
وہ مرد مجاہد تو نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ وپے میں فقط مستی کردار

[اقبال]

داعیان دین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا بخوبی جانتا ہے کہ وہ عوام کے درمیان اپنے اخلاق وعادات اور مضبوط کیرکٹر کی وجہ سے ضرب المثل ہوتے ہیں۔ اور عوام کی آنکھیں داعیان دین کے کردار پر لگی رہتی ہیں۔ کردار کی زبان سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔
بقول شاعر ؎

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
جو کام کہ انسان کا کردار کرے ہے

کسی بھی معاشرے میں نیک عناصر خال خال ہی ہوتے ہیں اس لیے جب بھی عوام کسی مثالی شخص کو دیکھتے ہیں تو وہ بے ساختہ اس کی طرف لپکتے ہیں اور اس سے تعلق پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

عوام کے جذبات خارجی اثرات کو قبول کرنے میں بالکل پانی کے مانند ہوتے ہیں جو سردی اور گرمی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ جذبات بھی نہایت آہستگی کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔ شاید یہ تاریخ کے ان واقعات کی تفسیر ہے جن سے انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام مصلحین کو مختلف زمانوں میں سابقہ پیش آتا رہا ہے۔

جب حق لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تو ابتداءً انہوں نے اعراض کیا، اس کی تکذیب

کی، اس کا انکار کیا، یہاں تک کہ مصلحین پر تکلیفوں اور مشقتوں کے پہاڑ توڑے گئے۔ سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۔ [البقرہ: ۸۷/۲]

"پھر یہ تمہارا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا، اور کسی کو قتل کر ڈالا۔"

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات بھی بدلتے رہے اور ان انبیاء اور مصلحین کی وفات کے بعد انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ پھر وہ ہوش میں آئے اور اپنی سابقہ غلطیوں پر پچھتائے۔ اس کے بعد ان مصلحین کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہا۔ اس کے لئے انہوں نے مختلف طریقے اپنائے اور غلو میں مبتلا ہوتے گئے اور آخر کار انہیں الوہیت کا درجہ دے دیا۔ اس طرح وہ ایک نئی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کردار کی پاکیزگی سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز اس قدر متاثر کن نہیں ہو سکتی۔ گفتار کا غازی ہونا بھی ایک بہترین فن ہے لیکن اس فن کو جس طرح نیک لوگ استعمال کر سکتے ہیں ویسے ہی جھوٹے، مکار اور شعبدہ باز لوگ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح نیک و بد کی اس میدان میں کوئی تخصیص نہیں۔

اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ [بقرہ: ۲۰۴/۲]

"انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔"

اس لیے ایک داعی پر سب سے پہلی ذمہ داری اپنی ذات کی اصلاح ہے۔ تہذیب

وشائستگی کے جوہر سے پہلے خود مالا مال ہو۔ اگر اس نے اپنی اصلاح کر لی تو توقع کی جا سکتی ہے وہ دوسروں کی اصلاح کر سکے گا۔

ایک مدت تک دعوت کا کام کرنے والوں کے ساتھ رہ کر میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ " دوسروں کے بجائے سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے" اور اس باب میں ہم اسی نکتہ کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

آدمی امتیازی اوصاف کا حامل بن کر ممتاز لوگوں کی فہرست میں آجاتا ہے اور کسی آدمی کو نیک اس وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کے اندر اچھائی کے پہلو نمایاں ہوں اور کسی شخص کو برا اس وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کے اندر برائی کے پہلو نمایاں ہوں۔ داعی صحیح معنوں میں اس شخص کو کہا جا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری کو اپنی سیرت و کردار اور عادات واطوار بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ذریعے انجام دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۔[فاطر ۳۲/۳۵]

" پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔"

داعی وہ شخص ہو سکتا ہے جو اس گراں بار ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے خصوصی تیاری کرے۔ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام نے اسے انجام دیا۔ کیونکہ یہ نہایت عظیم ذمہ داری ہے۔ لیکن ذمے داری کا یہ احساس اس شخص کو جو حق سے اچھی طرح واقف ہو، اسے دعوت و تبلیغ سے روک نہیں سکتا۔ یہاں ہم ایسے ہی لوگوں سے مخاطب ہیں دعوتِ حق جن کی زندگی کا مقصد اور نصب العین ہو۔ نیچے ہم ان اوصاف کی وضاحت کر رہے ہیں جن سے متصف ہونا ایک داعی حق کے لئے ضروری ہے۔

پاکیزگی اور ایثار:

ایک داعی کو لوگوں کے مال و دولت کی طرف نظر نہیں اٹھانی چاہیے تاکہ وہ لوگوں کی نظر میں باعزت اور سربلند رہ سکے اور جس چیز کی تبلیغ وہ کرنا چاہتا ہے بغیر لاگ لپیٹ کے کر سکے۔ کسی کا اس پر احسان نہ ہو جس سے اس کا ہاتھ رک جائے اور زبان بند ہو جائے غرض کہ

داعی کو اس حد تقویٰ اور پاکیزگی کی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے جس حد تک ممکن ہو سکے۔

داعی کو ذاتی اختلافات سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہیے۔ اسے غیرت مند اور مفاد عامہ پر اپنے ذاتی مفاد کو قربان کرنے والا ہونا چاہیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر مسلم بھائی کو اپنے اور اپنے خاندان پر ترجیح دے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایثار کا بہترین عملی نمونہ تھے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ دیا۔ پھر مانگا پھر دیا اور اس طرح کرتے رہے یہاں تک کہ جب سارا مال ختم ہو چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہمارے پاس جس قدر مال ہے اسے ہم تم سے چھپا کر جمع نہیں کریں گے۔ جو حرص سے محفوظ رہے گا اللہ اسے مزید نوازے گا۔ جو بے نیازی کا طالب ہو گا اللہ اسے بے نیاز کر دے گا اور جو صابر بننا پسند کرے گا اللہ اسے صبر کی نعمت سے مالا مال فرمائے گا۔" پھر فرمایا: "اور صبر سے بڑھ کر نعمت کوئی نہیں ہے جسے دی جائے۔" [بخاری: کتاب الزکاۃ]

فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی:

فراخ دلی وہ صفت ہے جو داعی کو ممتاز کر دیتی ہے۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان سے خطاء ہو سکتی ہے اور اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، اس لیے یہ کیسے مناسب ہے کہ بندے آپس کی غلطیوں پر معذرت قبول نہ کریں (معذرت ہی توبہ ہے) پھر ایک مصلح کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان الفت و محبت کے بیج بوئے تاکہ آپسی اتحاد برقرار رہے اور مؤمنین کی صفوں میں مضبوطی پیدا ہو۔ پھر ان لوگوں کے سلسلہ میں اس صفت کا اظہار کیوں نہ لازم ہو گا جو معاشرے کے نیک لوگ ہیں۔

اختلاف کی بنیاد ہمیشہ یا تو کسی غلط فہمی یا اپنی ذات کے سلسلہ میں تنگ نظری پر ہوتی ہے اسی لئے اختلافات کو ختم کرنے کا طریقہ ایک داعی کے نزدیک ہمیشہ یہی رہا ہے کہ لوگوں کے سلسلے میں فراخ دلی، دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنے کی صفت پیدا ہو۔

داعی کے عظیم مقصد پر نظر ڈالتے ہوئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے چشم پوشی کی صفت پیدا کرے جو ایک قافلے کے مسافروں سے سرزد ہوتی رہتی

ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلاً ۔ [احزاب: ۴۸/۳۳]

"اور کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کرو اللہ پر۔ اور اللہ ہی اس کے لئے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کردے۔"

اور عام مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔

[آل عمران: ۱۰۳/۳]

" اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے، اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔"

کوئی عقل مند شخص کسی بڑی اور نفع بخش چیز کو اس لیے نہیں ختم کر دیتا ہے کہ اس میں کچھ خرابی آگئی ہے بلکہ سب سے پہلے وہ ان خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ بڑی چیز بیکار نہ ہو جائے۔ اسی طرح بہترین اور نیک عناصر اس معاشرے میں بہت کم ہوتے ہیں اس لیے اگر ان سے غلطیاں ہو جائیں تو ایک بڑے نفع کی امید میں انہیں درگذر کر دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ [آل عمران: ۱۵۹/۳]

" ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔"

دعوت اسلامی کی یہ خصوصیت ہے کہ اتحاد کو پسند اور افتراق وانتشار کو ناپسند کرتی ہے محبت کے بیج بوتی اور بغض کی بیخ کنی کرتی ہے۔ قلیل کو قربان کرتی ہے تاکہ کثیر کو حاصل کرسکے۔ جو ان چیزوں کو سمجھ کر انہیں عملی جامہ پہنائے گا صحیح معنوں میں وہی صراط مستقیم ہے۔

قربانی اور اس کی متعدد شکلیں:

داعی ایک ایسا قائد ہوتا ہے جو لوگوں کو جان ومال کی قربانی کے لئے تیار کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ معاشرے کی مطلوبہ مساوات کو برقرار رکھ سکے اور اسے فقر وغنیٰ، قوت

وضعف اور علم و جہل کی افراط و تفریط سے بچاسکے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ قربانی دینے میں بھی لوگوں کے لئے نمونہ ثابت ہو۔

* وقت کی قربانی کیونکہ وقت ہی زندگی ہے۔
* مال کی قربانی، خواہ کم ہو یا زیادہ تاکہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جاسکے اور فقر کی راہیں بند کی جاسکیں۔
* تکلیف دہ چیزوں کو برداشت کرنے کی قربانی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ اللهِ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذَالِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ [آل عمران: ۱۸۶/۳]

" اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنوگے اگر ان حالات میں تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

یہ بات معلوم ہے کہ ان مصائب کو نہ جھیل پانے کی وجہ سے بہت سے لوگ حق کی طرف آنے سے گریز کرتے ہیں۔

* متوقع نفع کی قربانی، کیونکہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو نفع وضرر کا مالک ہے اور بندوں کا دل اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے داعی کو کسی ایسی چیز کی حرص نہیں کرنا چاہیے جو فانی ہے۔ اسے اپنی ساری توقعات کا مرکز اللہ اور صرف اللہ کو بنانا چاہیے۔

آخری قربانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شوق شہادت سے سرشار رہے۔ اور اللہ سے توقع رکھے کہ وہ اسے شہادت کی موت سے ہمکنار کرے گا، اللہ سے دعا کرے گڑگڑائے کہ اے اللہ! ہمیں شہیدوں کا درجہ عنایت فرما..... اور جب اس کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی تو یہ چیز خود اس کے درجات بھی بلند کرے گی اور دوسروں کے لیے نشان راہ ثابت ہو گی۔

نیکوکاروں سے تعلق:

ایک داعی کی ممتاز ترین صفت یہ ہے کہ وہ اپنے دعوتی میدان کے ہم سفروں سے دوستی کا خواہاں ہو۔ ان سے ہمیشہ اچھے تعلقات رکھے، ان سے ملاقاتیں کرتا رہے اور ان کے

احوال سے واقفیت حاصل کرتا رہے۔ کیونکہ یہ باہمی روابط اپنی عمومی شکل میں، خود انسانی فطرت کی پکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ [الحجرات: ۴۹/۱۳]

"اور پھر ہم نے تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔"

اس لیے آپس کے تعلقات اور باہم تعاون کرنے کا جذبہ خصوصاً دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تصور کیجیے کہ کسی شہر میں بیس عالم دین رہتے ہیں لیکن ان کے آپس کے تعلقات ٹھیک نہیں رہتے نہ کبھی ملتے جلتے ہیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں سوچیے ان کا رہنا یا نہ رہنا شہر والوں کے لئے کیا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ عوام کی طرف سے شدید تنقیدات کا ہدف بنتے ہیں کیونکہ ان کے قول و فعل میں تضاد ہے وہ لوگوں کے اختلافات کی وجہیں تو بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن اولیاء اللہ وہی ہوتے ہیں جو سنی سنائی باتوں پر کان نہیں دھرتے اور جاہلوں کی طرح شیطان کے پھندے میں نہیں پھنستے، دل میں کسی کے خلاف کینہ نہیں رکھتے، اپنے بھائیوں سے خواہ کوئی ہو کسی بڑی یا چھوٹی بات کی بناء پر قطع تعلق نہیں کرتے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ میں شیخ محب الدین الخطیب رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، باتوں باتوں میں ہندوستان کے ایک جید عالم مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا ذکر آگیا۔ میں چونکہ مولانا سے متعارف نہیں تھا اس لیے میں نے کہا: "شاید آپ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ذکر کر رہے ہیں؟" انہوں نے تعجب خیز نظر مجھ پر ڈالی اور کہنے لگے: آپ دعوت کا کام تو کرتے ہیں لیکن اتنے عظیم داعی سے بھی آپ واقف نہیں ہیں۔ جایئے اور سب سے پہلے ان لوگوں سے تعارف حاصل کیجیے۔ جو آپ کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم سفر ہیں پھر دعوت کی نشرواشاعت کا کام کیجیے گا۔"

اس واقعہ کو آج پچیس سال ہو رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارے گاؤں میں چار مشائخ موجود ہیں، میں تو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ سے شرم کھا کر ان سے ملاقات کے لئے چلا جاتا ہوں مگر آج دو

سال ہو رہے ہیں ان میں سے کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔

اے راہ دعوت کے مسافرو! ذاتی اختلافات کو چھوڑ دو کیونکہ یہ سب دنیا کی غلاظتیں ہیں:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

[آل عمران: ۷۹/۳]

"بلکہ سچے اللہ کے عبادت گزار بندے بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے اور جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔"

دینی تربیت کا فن:

اس کے دو طریقے ہیں: (۱) تعلیم (۲) تربیت

(۱) تعلیم: یعنی دوسروں کو علم سے روشناس کرانا۔

(۲) تربیت: یعنی عقل، جذبات اور دوسری انسانی طاقتوں کو بتدریج ایک نکتہ پر مرتکز کرنا۔ داعی اپنے دعوتی کام کو ان حدود سے باہر انجام نہیں دیتا یا تو وہ معلم ہوگا یا مربی!! اور جب یہ واضح ہو گیا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں نہیں اور دینی اسرار و رموز کی گرہ کشائی اور اس سے کما حقہ استفادہ دنیاوی علوم کے بغیر نہیں ہو سکتے تو دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم کا اہتمام والتزام بھی لازم ہے تاکہ خالق اور مخلوق کے درمیان ربط پیدا ہو سکے۔

دین حرکت و عمل کا نام ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ طلبہ کو اس حیثیت سے کرانا چاہیے کہ ان کے اندر دین کی روح بیدار ہو سکے اور ان کے اندر اس بات کا صحیح شعور پیدا ہو کہ دنیاوی معاملات میں کسے اختیار کیا جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے اور اللہ اور رسول کی محبت اس کے دل میں بیٹھ جائے۔ اس کے برعکس آج ہم دیکھتے ہیں کہ طالب علم امتحانات کو اول نمبر سے پاس کر لیتا ہے، لیکن اس کے اندر دین، علماء دین اور سارے دیندار حضرات سے نفرت موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک عظیم جرم ہے اور یقیناً اس کے ذمہ دار اساتذہ ہیں، کیونکہ اگر وہ طلبہ میں دینی جذبات پیدا کرنے کے صحیح معنوں میں خواہش مند ہوتے تو یہ ناقابل فہم ہے کہ طلبہ اس سے متاثر نہ ہوتے۔

علم دین سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ معلم اس میں دل و دماغ کی پوری توانائی

صرف کر دے اور کہنے سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہو تاکہ معلم اور متعلّم دونوں کے اندر اس علم کے لئے شوق ورغبت اور والہانہ لگاؤ پیدا ہو سکے۔ معلم طلبہ کے سامنے دین کا جوہر اور اس کی روح پیش کرنے کی کوشش کرے، درس کے دوران فقہی اختلافات، بے مغز باتوں اور خلاف وقار طریقوں کو راہ نہ دے۔

طلبہ کو جس چیز کے کرنے کا حکم دے پہلے خود اس کا پابند بنے تاکہ طلباء کی نظر میں وہ مثالی نمونہ بن سکے ورنہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا اور اللہ اور بندوں دونوں کے غضب کا مستحق ہو گا۔ اپنے طلبہ کے اندر تعصب اور ہٹ دھرمی کا مرض پیدا نہ ہونے دے کہ وہ ایک دوسرے پر بڑائی کا اظہار کرنے لگیں۔ بلکہ ان کے اندر رحمت و محبت کے بیج بوئے۔ کیونکہ دین دعوتِ اخوت اور انسانی دلوں کے کینہ وتعصب کے بہترین علاج ہی کا دوسرا نام ہے۔

دینی علوم کو عملی زندگی سے مربوط کرکے پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کو بیان کرنے کے لئے کتنا بہترین پیرایہ اختیار کیا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

[اعراف: ۷/۱۵۷]

" اللہ کے رسول ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پے لدے ہوئے تھے، وہ بندش کھولتا ہے جن سے وہ جکڑے ہوئے تھے لہٰذا جو لوگ ان پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اسی روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

نصیحت کرنے میں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مختصر عام فہم اور لائق عمل ہو۔ دوسروں کی اہم ضروریات سے متصادم نہ ہو۔ ایسے لڑکے جو ہر کام اور ہر بات میں والدین اور معلم کی نصیحت کی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہیں نافرمانی اور برے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ آزادئ فکر اور آزادئ کفر دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں:

هُوَالَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ [تغابن: ۲/۶۴]

" وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کوئی کافر ہے، کوئی مؤمن"۔

جنگ جو کافر کے سلسلہ میں یہ حکم ہے کہ وہ ابدی دشمن ہے۔ ذمی کے سلسلہ میں آتا ہے کہ وہ وطن کے معاملے میں دوست ہے اور جب تک وہ معاہدے کی شرائط پوری کرتا رہے اس کے حقوق کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے۔

اور مسلمان اللہ کے دین کا محافظ اور اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اگر وہ اللہ کے دین سے بغاوت پر اتر آئے تو تلوار کے علاوہ اس کا کوئی اور علاج نہیں ہے اور اس کی یہ باغیانہ حرکت مسلمانوں میں فکری اور اعتقادی فساد پھیلانے کے ہم معنی سمجھی جائے گی۔

دین کے اساسی تصورات جو ہر زمانے میں ایک ہی رہے ہیں ان میں کوئی تبدیلی اور کوئی تغیر حالات زمانہ کے اختلاف سے پیدا نہیں ہو سکتے، وہ کل تین ہیں:

۱: اللہ تعالیٰ پر ایمان۔

۲: آخرت، فرشتوں اور تقدیر پر ایمان۔

۳: تمام نبیوں پر ایمان اور آخری نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق، قرآن اور اس کے تمام احکام کی تصدیق، اللہ اور رسول کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت۔

اخلاق حسنہ سے آراستہ ہونا برائیوں اور نافرمانیوں سے پرہیز کرنا اور اس کے علاوہ دوسری تمام چیزیں اجتہادی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان پر بحث ومباحثہ اور حالات وظروف کے لحاظ سے ان کے اجراء ونفاذ پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

جب بھی موجودہ دور میں کوئی اسلامی تحریک رونما ہوئی ہے تو لوگوں کو دین سے روشناس کرانے کے لئے عوامی اسلوب کو اختیار کرنے اور تمام لوگوں کو شریعت کے بنیادی امور کی طرف متوجہ کرنا اور ان میں سیرت وکردار پیدا کرنا ناگزیر رہا ہے۔ لیکن جب مختلف گروہ دین سے روشناش ہوئے تو ان کے اندر بے عملی راہ پانے لگی اور اس کے ساتھ ہی فکری کم مائیگی

اور احساس ذمہ داری کا فقدان بھی راہ پاتا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عملی زندگی میں اسلام نے مختلف مسائل کے جو حل پیش کئے ہیں اس سے لوگ بے گانہ رہ گئے ہیں۔

عربی زبان کا اہتمام:

کیا یہ کوئی اتفاقی بات ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پیغام کو پہنچانے کے لئے دوسری ہزاروں زبانوں کو چھوڑ کر صرف عربی زبان کا انتخاب کیا ہے؟ پھر صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ پر اس کی اہمیت کی مختلف انداز سے وضاحت بھی فرمائی ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ [الزمر:۳۹/۲۸]

"ایسا قرآن جو عربی میں ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، تاکہ یہ برے انجام سے بچیں۔"

كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ [الشوریٰ: ۴۲/۷]

" ہاں! اسی طرح اے نبی! یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کی تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گردو پیش رہنے والوں کو خبردار کردو۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل کرنا کوئی اتفاقی معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ ہے کہ کسی چیز کی وضاحت کے لئے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرنا جو عقل انسانی کی گرفت میں مکمل طور سے آسکے۔ اس کے لئے عربی زبان نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ یہ بڑی شریں زبان ہے، ترکیب آسان اور تقریر و تحریر میں ایجاز واختصار کا نمونہ ہے۔ نازک سے نازک جذبات کی تعبیر کے لئے عربی زبان کا دامن نہایت وسیع ہے۔ اسی طرح تمام علوم اور فلسفوں کے استقصاء کے لئے اس سے بہتر زبان کوئی اور نہیں۔

ماضی کی تاریخ اور عصر حاضر کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام دشمنوں نے جب بھی مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیرنا چاہا تو انہوں نے سب سے پہلے اس زبان سے ان کے تعلقات کو منقطع کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وحدت و محبت کے ان سوتوں پر ہی بند لگا دیں جنہوں نے انہیں ایک امت بنا دیا ہے، اس طرح انہیں کسی بھی باطل افکار و نظریات کے سیلاب میں بہالے جانا نہایت آسان ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ چنانچہ افریقہ اور ایشیا جیسے ملکوں میں آج سیکڑوں مسلمان اسلام

سے بالکل کٹ کر رہ گئے ہیں، ان میں بہتوں کو تو کلمہ تک یاد نہیں ہے اور کلمہ تو چھوڑیئے وہ سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔

ان اسباب کے پیش نظر ہم داعی کو عربی زبان کی طرف توجہ دینے اور عام لب ولہجہ سے گریز کرنے کی وصیت کرتے ہیں اور دوسری زبانوں کا استعمال صرف اسی وقت کریں جب اس کے بغیر تبلیغ ناممکن ہو۔ بس ایک وقتی علاج کے طور پر اور موقع ملتے ہی فوراً اس زبان کو چھوڑ دے اسے ہمیشہ کے لئے اختیار نہ کرے۔

چنانچہ جب اسلامی انقلاب تیزی سے ارتقاء کی منازل طے کر رہا تھا اس وقت عربی زبان مفتوح قوموں کے درمیان سایہ کی طرح بڑھ رہی تھی اور عوام اس زبان کو سیکھنے اور اس میں باتیں کرنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ پھر زمانہ بدلا اور فاتحین کے اسٹیج پر استعمار پسند آئے چنانچہ عوام ان کی طرف لپکے اور تیزی سے فاتح قوموں کی زبان اختیار کرنے لگے، گویا اس کا سیکھنا ان کے لئے فرض ہو گیا۔

آج کل ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں مغربیت بری طرح سے شکست کھا گئی ہے۔ ان حالات میں ہمارے اوپر فرض عائد ہوتا ہے کہ عربی زبان کے احیاء کے لئے جان توڑ کوشش کریں کہ یہی کوشش اسلام کے احیاء کی تمہید ہے۔

بہت سے ملکوں نے اپنے یہاں کی مقامی زبانوں کو فروغ دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایسے الفاظ کو رواج دینے کی طرف توجہ کی ہے جو بولنے اور لکھنے میں آسان اور کثیر الاستعمال ہوں اور یہی الفاظ درس وتدریس اور تعلیم کے دوسرے ذرائع میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مسلمان بھی اس عظیم الشان زبان کو فروغ دینے کے لئے اسی طرح کی کوششیں کرتے جس میں ہماری شریعت نازل ہوئی ہے۔

اجتماعی کاموں کی اہمیت:

بعض اسلامی مفکرین کا یہ خیال ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کو سماجی خدمات کے پروگراموں میں حصہ نہیں لینا چاہیے اور یہ کہ اسلام میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی یہ اسلام کی بنیادی چیزوں میں سے ہے۔

اس کے برعکس کچھ اور اسلامی جماعتیں ہیں جو اسے عملی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری خیال کرتی ہیں اور دعوت کا کام کرنے والوں کو اس طرح کے کاموں میں حصہ لینے کی ترغیب بھی دیتی ہیں ان کے خیال میں انقلاب اسلامی کی بازیابی بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں حکومت اسلامیہ کے قیام کے لئے سماجی خدمات کے کاموں میں لگنا وہ کام ہے جس کے لئے اپنی ساری جدوجہد صرف کر دینی چاہیے کہ یہی اصلاح کی بنیاد ہے۔

اجتماعی خدمات میں حصہ نہ لینے والوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کی خدمات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ظالم حکومت کی بنیادیں مضبوط کر رہے ہیں اس سے ان کی حکومت کو استحکام آئے گا اور ان کا زمانہ بھی طویل ہوگا جس سے حکومت اسلامیہ کا قیام کافی لمبی مدت گذر جانے کے بعد ہی متوقع ہو سکتا ہے۔

دوسرا فریق اس اعتراض کا جواب مندرجہ ذیل دلائل سے دیتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو نیکی کا کام کرنے کی تلقین کی ہے اور اس میں زندگی کے تمام گوشوں کو شامل کیا ہے اس لیے حکومت وسیاست جن کا تعلق افراد انسانی سے بڑا گہرا ہے اس سے صرف نظر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

[الحج:۷۷]

" اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو، اسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہوگی۔"

انسانوں کی حاجتیں اور ضرورتیں بے شمار ہیں، اس لیے حکومت اسلامیہ کے قائم ہو جانے تک ان مسائل سے صرف نظر کرنا داعی کے لئے جائز نہیں ہے مختلف صورتوں میں سے چند یہ ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، مریضوں کا علاج، جاہلوں کی تعلیم، سیدھے راستے کی طرف ان کی ہدایت اور لوگوں کے درمیان محبت ومودت کے جذبات کی تخم ریزی۔

مقصد کے حصول میں کبھی کبھی عمریں ختم ہو جاتی ہیں اور صدیاں بھی بیت جاتی ہیں مگر مقصد حاصل نہیں ہو پاتا تو کیا انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے والوں کو روک دیا جائے اور

اتنی مدت تک لوگوں کو یونہی کرب والم میں تڑپتا چھوڑ دیا جائے؟

مندرجہ بالا وجوہ کی بنیاد پر یہ فریق اجتماعی خدمات کے کام کو لازم ٹھہراتا ہے اور دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے اس طرح کی کوششوں کو ضروری خیال کرتا ہے۔ اس طرح سے بیشتر مسلم ممالک میں عوامی خدمات کے پیش نظر درج ذیل ادارے قائم کئے گئے ہیں اور عوامی خدمات کے نقطۂ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے دعوت کا کام کرنے والے بھی اس سلسلہ میں ان کو اپنا تعاون دے سکتے ہیں۔

* ... تعمیر مساجد کی کمیٹیاں
* امن عامہ کمیٹیاں
* مسافر خانے
* عوامی رہنمائی کی کمیٹیاں
* امداد باہمی کی یونٹیں
* لاوارث بچوں کے تربیتی ادارے
* تعلیم بالغان کے شعبے
* حفظ قرآن کے شعبے
* صحت وورزش کے کلب
* صلاحتیوں کو نشوونما دینے کے مراکز
* ضعیفوں اور معذوروں کی دیکھ بھال کے ادارے
* خواتین کی انجمنیں

اس کے علاوہ بھی اجتماعی کاموں کے بہت سے اہم میدان ہیں جن کے ساتھ کام کرنا ہر داعی کے لئے ضروری ہے..... کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور نواہی سے اجتناب ہی ایک مؤمن کی زندگی کا نصب العین ہے۔

فلاحی اداروں کا قیام:

اس کا تذکرہ گزشتہ سطروں میں آگیا ہے البتہ اس کا پہلو تعمیری ہے۔

* مساجد ومدارس نیز شفاخانوں کا قیام۔
* فیکٹریوں بجلی پاور ہاوسز اور پانی کے ذخیروں کا انتظام۔
* مکاتیب اور مختلف قسم کی ریلیف کمیٹیوں کا قیام۔
* دعوت کے مراکز نیز عوامی مہمان خانوں کی تعمیر وغیرہ۔

یہیں پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ سماجی خدمات مقصد نہیں بلکہ معاشرہ کی

ترقی نیز اس کے دکھوں کو دور کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ تاکہ ہم امن وسلامتی کی دعوت کو مکمل طور سے غالب ونافذ کر سکیں۔

عام مظاہر:

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہترین مظاہر جن سے بہترین رسم ورواج اور دینی افکار وخیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دعوت دین کو فروغ دینے میں ان کا انتہائی متاثر کن رول رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تحریک اسلامی کے رفقاء ایک ایسا ماحول بنا سکتے جو سچی اسلامی تعلیمات کا مظہر ہوتا یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن کریم ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔ [آل عمران: ۱۰۴]

"تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں"

بہت سے مفکرین صدیوں سے اس طرح کے ایک مثالی معاشرہ کی تعمیر کی خواہش رکھتے ہیں اور اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے "المدینۃ الفاضلۃ" اور "المجتمع المثالی" جیسی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ جس میں انہوں نے ایک مثالی معاشرہ کے قیام کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ یوں تو تمام ہی حکومتیں برابر ایک مثالی معاشرہ کی تعمیر میں کوشاں ہیں لیکن ان کا اپنا ایک مخصوص طریقہ کار ہے۔ اسلامی طریقوں سے انہیں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح کے اجتماعی اداروں اور انجمنوں کا قیام کچھ مخصوص حالات کی بناپر ناممکن ہو تو ایسی صورت میں ہم داعیان دین کو یہ وصیت کرتے ہیں کہ وہ اپنے دائرے کی حد تک اپنے اوپر اپنے متعلقین کے درمیان زندگی کے مختلف معاملات میں مثالی طرز عمل اپنائیں۔ جیسے زندگی کے چند انفرادی شعبے یہ ہیں:

ازدواجی اور معاشرتی آداب:

* تفریحی محفلوں اور سفر وحضر کے آداب
* تجارت اور لین دین وغیرہ کے آداب
* گھروں کی آرائش اور کپڑوں کی وضع قطع
* تربیت اور امور خانہ داری کی تعلیم

اس سلسلہ میں ہم اپنے علماء وفضلاء اور دیگر ارباب فن کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے مذکورہ بالا میدانوں میں تصنیف وتالیف اور دور جدید کے تقاضوں کے مطابق کچھ ایسے مثالی خطوط بنائیں جنہیں ہم دنیا کے سامنے ایک چیلنج کی حیثیت سے پیش کر سکیں اور جس کا اختیار کرنا اور عملی جامہ پہنانا لوگوں کے لئے ممکن ہو۔

کردار کی اثر آفرینی کے کچھ نمونے:

مصر کے ایک شیخ ہیں جن سے میں اچھی طرح واقف ہوں ان کا کردار ایک مثالی کردار تھا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے نوجوان طلبہ سے اپنے ایک روزہ دورے پر ضرور ملتے تھے اگر کبھی ملاقات کی نوبت نہ آتی تو شہر کے اجتماعات میں ملاقاتیں کر لیتے۔

اپنے طلبہ کو لے کر وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے جس میں لمبی سورتوں کی تلاوت کرتے پھر وہ انہیں امامت کے لئے آگے بڑھاتے اور اسی طرح ان کی بتدریج تربیت کرتے اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرتے پھر وہ انہیں حفظ و تجوید کے لئے مجبور کرتے، ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور کھانے کے دوران وہ دعائیں انہیں یاد دلاتے جو کھانے کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ وہ ان کی جسمانی تربیت بھی کرتے تھے اور اس دوران تیر اندازی، دوڑ کے مقابلے کرواتے اور قوت وطاقت نیز جہاد کی فضیلت بیان کرتے۔ وہ ان کے ساتھ روحانی مجلسیں بھی منعقد کرتے جس میں ذکر وفکر، تلاوت قرآن مجید، دین کی طرف راغب کرنے والی کہانیاں اور بہترین حکایتیں سناتے۔ ان مجلسوں میں بیٹھ کر خشیتِ الٰہی سے گریہ وزاری اس قدر بڑھ جاتی کہ دل موم ہوتے محسوس ہوتے۔ وہ انہیں نماز تہجد کے لئے جگاتے تھے اور اس کا اہتمام اجتماعی طور پر بھی کرتے تھے اور انفرادی طور سے بھی..... خود سب سے پہلے اٹھتے۔

طلبہ کو دعوت وخطابت کے طریقوں کی مشق کراتے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے پر تنقید بھی کراتے تھے تاکہ زبان کی بندش کھل جائے اور اس طرح وہ عوام میں اپنا کام کر سکیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں یا سفروں میں محبت کا ایک عمیق احساس پیدا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ طبیعت میں تہذیب، دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے اور

حسین یادوں سے سینہ معمور ہو جاتا ہے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اگلے اجتماع میں شرکت کا اشتیاق ہوتا ہے اور وہ تمام بہانوں کو پس پشت ڈال کر دل چسپی سے کام کرتے ہیں اور پوری جماعت سے یکسر جدا نہیں ہو جاتے۔

اسی طرح شام کے ایک شیخ سے میں بخوبی واقف ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو اور ان کو جنت میں بہترین جگہ دے۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ اگر آپ کی ان سے ملاقات ہو جاتی تو آپ یہ سمجھتے کہ شاید صحابہؓ وتابعینؒ کے کسی فرد سے ملے ہیں وہ لوگوں کے ساتھ اس طرح رہتے تھے گویا سب سے زیادہ حقیر انسان ہیں۔ ہمیشہ خوش رہتے لوگوں کی خدمت کرتے اور تمام لوگوں کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے۔ اور ان کی خدمت کرتے تھے اپنے اہل وعیال کے ساتھ کفاف پر گزر اوقات کرتے، سادگی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انہوں نے ایک مسجد کی امامت کو چیف جسٹس جیسے اہم عہدہ پر ترجیح دے دیا۔ احتیاط کے طور پر بہت سی جائز چیزوں سے بھی بچتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے رہٹ دیکھنے کی گزارش کی وہ مجھے لے کر چلے۔ یہاں تک کہ جب نصف کلومیٹر کا فاصلہ رہ گیا تو وہیں رک گئے اور اشارہ کرکے فرمایا" وہاں ہے اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ میں یہیں ہوں" میں گیا اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا اور ان سے کہا کہ آپ کے وہاں نہ جانے کا سبب مجھے معلوم ہو گیا انہوں نے کہا" ہاں لڑکے وہاں ننگے نہا رہے تھے"

اپنے بڑے بھائی کی وفات کی بابت ہمیں بتاتے اور ان کے علم اور دین داری کی تعریفیں بھی کرتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ بڑے بھائی کی زوجہ اور ان کے بچے کیسے ہیں انہوں نے کہا کہ میں ابھی کل ہی دوسرے گھر میں منتقل ہو گیا ہوں بارہ سال سے وہ میرے ساتھ رہتی تھیں لیکن ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا جس دن میں منتقل ہو کر آنے لگا تو وہ اپنا رُخ دوسری طرف کئے ہوئے تھیں اور انہوں نے مجھے سلام کیا۔

عبرت کے لئے:

مسجد میں آپ کا درس ہوتا جس میں لوگ شریک ہوتے درس، فقہ، تفسیر، اصول، نکات ادب اور شعر سے بھرپور ہوتا، وہاں بیٹھ کر آپ خواہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں اپنے

آپ کو ایک طالب علم محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی گود میں ایک فاختہ آکر گری اور نہایت پر سکون انداز میں وہیں پڑ گئی۔ یہ دیکھ کر شیخ موصوف رونے لگے اور فرمایا کہ مجھے محمد بن حزم سے کیا نسبت؟ پھر یہ واقعہ بیان کیا کہ محمد بن حزم اندلسی مسجد میں درس دیا کرتے تھے ایک دن جبکہ وہ درس دے رہے تھے ایک کبوتری جس کا پیچھا ایک شکاری کر رہا تھا گھبرائی ہوئی آئی ان کی گود میں گری گویا وہ ان سے پناہ طلب کر رہی ہو یہ صورت حال دیکھ کر حاضرین میں ایک شاعر نے برجستہ یہ شعر کہا:

مَنْ عَلَّمَ الْوَرَقَاءَ اَنَّ مَحَلَّكُمْ حَرْمٌ وَاَنَّكَ مَلْجَاً لِلْخَائِفِ

"فاختہ کو کس نے بتایا کہ تمہاری پناہ گاہ حزم ہیں اور یہ کہ حضرت موصوف ڈرنے والوں کے لئے ملجا ہیں۔"

"تاریخ الجزائر" نامی کتاب میں ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک فرانسیسی شخص کہا کرتا تھا کہ میں اسلام کے نقوش مٹا دینے کے لئے آیا ہوں ایک مرتبہ اس نے ایک شیخ جن کا نام عبدالحمید تھا انہیں بلایا اور کہا کہ یا تو آپ اپنے افکار کو اپنے شاگردوں کے درمیان پھیلانے سے باز آجائیں ورنہ میں ایک عظیم الشان لشکر بھیجوں گا جو اس مسجد میں تالا لگا دیگا جہاں سے آپ ہمارے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں۔

شیخ عبدالحمید نے جواب دیا کہ اے ظالم حاکم تمہارے بس میں یہ نہیں ہے۔ اس پر وہ سخت غصہ ہوا اور پوچھا بھلا کیوں ممکن نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں شادی کی کسی محفل میں ہوتا ہوں تو وہاں تمام لوگ مجھ سے واقف ہو جاتے ہیں اور جب کسی تعزیت میں جاتا ہوں تو تمام شریک ہونے والوں کو نصیحتیں کرتا ہوں اور اگر میں کسی ٹرین میں سفر کرتا ہوں تو مسافر مجھے جان لیتے ہیں اور اگر میں جیل خانے میں ہوں گا تو تمام قیدیوں کو اپنی یہ باتیں بتاؤں گا اور اگر تم مجھے قتل کر دوگے تو لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اس لیے میرے محترم آپ کے لئے یہی مناسب ہے کہ ایسے شخص سے چھیڑ چھاڑ بالکل مت کیجیے۔ جس کا دین اور جس کی زبان ایک امت کی دین اور زبان بن چکی ہو۔

قریب قریب یہی وہ بات ہے جسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہی تھی جب انہیں

دمشق کے جیل خانے میں لے جایا جارہا تھا انہوں نے کہا قید میرے لئے خلوت ہے اور جلا وطنی میرے لئے سیاحت ہے اور قتل میرے لئے شہادت ہے۔

پھر کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا:

اِذَا اللّٰہُ اَحْیٰی اُمَّۃً لَنْ یَّزْدَھَا اِلَی الْمَوْتِ جَبَّارٌ وَّلَا مُتَکَبِّرٌ

"جب اللہ کسی امت کو زندہ رکھنا چاہے تو کوئی سرکش اور متکبر اس کی زندگی اس سے چھین نہیں سکتا۔"

ایک اور داعی جس کا حُسن کردار اور حسن اخلاق ضرب المثل ہے اس کا نام عمرو بن عبید رحمہ اللہ ہے۔ ایک عظیم محدث ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جیسے لوگوں کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ان سے حسن بصری کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ کیسے تھے؟ اس پر انہوں نے سائل سے کہا کہ تم نے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا ہے جن کا ملائکہ بھی ادب کرتے ہیں۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ اگر کسی کام کے کرنے کی ذمہ داری لیتے تو اسے کرکے ہی چھوڑتے اور اگر کسی کو کسی چیز کا حکم دیتے تو سب سے پہلے خود اسے کرتے اور اگر کسی کو کسی کام سے منع فرماتے تو سب سے پہلے خود اس سے رُک جاتے، ہم نے کسی بھی شخص کا ظاہر اس کے باطن سے اور اس کا باطن اس کے ظاہر سے اتنا مشابہ نہیں دیکھا جتنا کہ بصری رحمہ اللہ کا تھا۔

یہی عمرو رحمہ اللہ ایک مرتبہ ابو جعفر منصور کے دور خلافت میں اس کے پاس گئے خلافت سے قبل وہ اس کے رفیق اور دوست بھی رہ چکے تھے۔ خلیفہ منصور نے انہیں اپنے سے قریب کرلیا اور بٹھایا اس نے کہا مجھے نصیحت کیجیے، آپ نے اسے نہایت عمدہ باتوں کی نصیحت کی اور جب اٹھنے لگے تو اس نے اُن سے کہا ہم نے دس ہزار درہم دینے کا فیصلہ کیا ہے اس پر عمرو رحمہ اللہ نے فرمایا: "خدا کی قسم میں اسے نہیں لے سکتا" اس مجلس میں مہدی جو ابو جعفر منصور کا لڑکا تھا وہ بھی حاضر تھا اس نے بصد تعجب کہا کہ امیر المؤمنین بھی قسم کھا رہے ہیں اور آپ بھی قسم کھا رہے ہیں، یہ سن کر عمرو بن عبید رحمہ اللہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا یہ نوجوان کون ہے؟ کسی نے بتایا کہ یہ ولی عہد ہیں۔ اس پر انہوں نے منصور کی طرف مڑ کر

کر کہا۔ سنو ! خدا کی قسم تم نے اسے ایسا لباس پہنا رکھا ہے جو متقیوں کا لباس نہیں ہے اور ایسے نام سے موسوم کیا جس کا وہ اہل نہیں ہے۔ پھر مہدی کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا" ہاں اے بھتیجے ! جب تیرے باپ نے قسم کھائی تو تیرے چچا نے اسے باطل کر دیا اور تیرا باپ تو تیرے چچا سے بھی زیادہ کفارہ ادا کرنے پر قادر ہے۔ پھر منصور نے ان سے دریافت کیا۔ کیا کوئی ضرورت ہے؟ جواب ملا کہ میرے پاس اس وقت تک کچھ مت بھیجیں جب تک میں خود نہ آؤں۔ منصور نے کہا، تب تو آپ میرے پاس آئیں گے ہی نہیں۔ انہوں نے کہا یہی تو میں چاہتا ہوں یہ کہہ کر وہ چلے گئے تو دیر تک منصور انہیں دیکھتا رہا پھر کہا۔

كُلُّكُمْ يَمْشِيْ رُوَيْدَ كُلُّكُمْ يَطْلُبُ صَيْدَ غَيْرَ عَمْرَو بْنِ عُبَيْد

تم میں سے ہر شخص آہستہ چلتا ہے، تم میں ہر شخص شکار کا طالب ہے، سوائے عمرو بن عبید کے۔

" مفید العلوم" نامی کتاب میں درج ذیل روایت ملتی ہے۔

مشہور محدث سفیان بن عیینہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ان کا بھتیجا ان کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آگیا۔ امام صاحب نے فرمایا: " جوڑا تو نہایت عمدہ ہے بیٹھو۔" وہ بیٹھ گیا تو سفیان رحمہ اللہ نے کہا ذرا قرآن کریم کی دس آیتیں پڑھو اس نے کہا نہیں پڑھ سکتا۔ پھر انہوں نے کہا اچھا دس حدیثیں پڑھو اس نے کہا یہ بھی یاد نہیں ہیں۔ پھر کہا اچھا دس شعر ہی سنا دو، اس نے کہا میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس پر انہوں نے کہا کس بنیاد پر میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں اس کے علاوہ میں تمہیں ناکام بھی لوٹانا نہیں چاہتا پھر آپ نے اسے چار ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

دیکھئے تو سہی اس عظیم داعی نے کس قدر کمال حکمت ودانائی سے کام لے کر اس نوجوان کو علم وادب سیکھنے کی طرف موڑ دیا چونکہ وہ ایک شائستہ اور نرم دل انسان تھے اس لیے انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ اس نوجوان کو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔

اس لیے مال سے اس کی مدد کی اس کو اعلیٰ ظرفی کہتے ہیں۔ تاریخ اسلام نیک لوگوں کے قصوں سے بھری پڑی ہے۔ اللہ کی ان پر رحمت ہو۔ یہاں ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

باب:۱۱

ابلاغِ دعوت کے وسائل

لوگوں تک دعوت پہنچانا قول کے ذریعے بھی ہوتا ہے عمل کے ذریعے بھی اور داعی کی سیرت کے ذریعے بھی، جس کی بنا پر داعی دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بن جاتا ہے اور وہ لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتا ہے۔ ان وسائل کے بارے میں ہم ذیل کے تین عنوانات کے تحت گفتگو کریں گے۔

1. قول (زبان) کے ساتھ ابلاغِ دعوت
2. عمل کے ساتھ ابلاغ دعوت
3. اچھے کردار سے ابلاغ دعوت

قول (زبان) کے ذریعے ابلاغ دعوت

ابلاغ دعوت میں قول کی اہمیت:

دعوت الی اللہ میں قول ہی اصل بنیاد ہے۔ قرآن کریم جو دعوت الی اللہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہی ہے جسے حضرت جبرائیل علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے پاس لے کر آئے تاکہ اس کے ذریعے دعوت پہنچانے کا انتظام ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ [التوبۃ۹: ۶]

"اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو وہ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔"

رسول اللہ ﷺ بھی اپنے رب کا پیغام قول کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے اور آپ ﷺ کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ لوگوں

سے کہیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ [یونس ۱۰: ۱۰۸]

اے محمد ﷺ! کہ دو کہ لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا [الاعراف ۷: ۱۵۸]

"اے محمد ﷺ! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی قوموں تک اپنے رب کا پیغام قول مبین کے ساتھ پہنچادیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

[المومنون ۲۳: ۲۳]

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ [الاعراف ۷: ۱۰۴]

"موسیٰ نے کہا: اے فرعون! میں کائنات کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔"

چنانچہ ایک داعی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ابلاغ دعوت میں اس بات سے غفلت کرے کہ اس ضمن میں "قول" کا کیا مقام ہے اور پاکیزہ کلمے کا دلوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ لوگوں تک حق پہنچانے میں 'قول' اصل ذریعہ ہے۔

گفتگو کے عمومی آداب:

گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ وہ واضح اور سلیس ہو، اس میں کوئی ابہام نہ ہو، سامع اس کو سنتے ہی سمجھ جائے۔ اس لیے کہ کلام کا مقصد مطلوبہ معلومات کو اس شخص تک پہنچانا ہوتا ہے جس سے بات کی جاتی ہے۔ اس بنا پر بات پوری طرح واضح ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو اپنی اپنی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ قوم کو جس چیز کی دعوت دی جارہی ہے اس کو وہ جان سکے۔ اس طرح نبی کو بھی وہ بات بیان کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ [ابراھیم ۱۴: ۴]

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا کام ہی یہ قرار دیا ہے کہ وہ کھلے اور واضح انداز میں اس کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں، تاکہ مخاطبین پر حجت قائم ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ [النور ۲۴: ۵۴]

"رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچادے۔"

کلام کے واضح ہونے کا معیار صرف داعی اور اس کا فہم ودانش نہیں ہے، اس لیے کہ بعض اوقات اس کے حق میں تو بات واضح ہوتی ہے، مگر مخاطبین کے حق میں وہی بات واضح نہیں کہلائی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی معیار نہیں ہے کہ بات فی نفسہٖ واضح ہو، اس لیے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بات اپنی جگہ واضح ہوتی ہے، مگر مخاطبین کے حق میں وہ غیرہ واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ واضح ہونے کا معیار یہ قرار پاتا ہے کہ بات مخاطبین کے لیے واضح ہو۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اشارہ کررہا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ [ابراھیم ۱۴: ۴]

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔"

چنانچہ بیان اور وضاحت ان کے حق میں ہونی چاہیے، نہ کہ داعی کے حق میں یا فی نفسہ کلام کا واضح ہونا۔ حدیث میں آیا ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی گفتگو "فصل" کے ساتھ، یعنی واضح اور ظاہر ہوتی تھی۔ اس کلام کو جو بھی سنتا، اسے سمجھ جاتا تھا۔

یہ بھی ضروری ہے کہ گفتگو ان نئے الفاظ سے خالی ہو جن میں حق اور باطل اور صحیح وغلط دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ داعی کو چاہیے کہ انہی الفاظ کا اہتمام کرے جو قرآن وسنت میں استعمال ہوئے ہیں، یا مسلمان علما کے ہاں رائج ہیں۔ اس لیے کہ ان الفاظ کے معنی متعین

اور مفہوم واضح ہوتے ہیں۔ ان میں کسی غلط معنی کی گنجائش نہیں ہوتی، جو بعض اوقات مخاطب کے ذہن میں معلق رہتے ہیں۔ اس انداز دعوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے واضح کیا:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا۔ [البقرۃ۲: ۱۰۴]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کی زبان میں لفظ راعنا کے غلط معنی بھی تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اس لفظ سے یہی غلط معنی میں مراد لیتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ اس لافظ کا استعمال چھوڑ دیں اور لفظ راعنا کے بجائے انظرنا کہیں، تاکہ یہود اس سے دلیل پکڑ کر راعنا کا لفظ نہ کہتے رہیں اور اس سے آپ ﷺ کو گالی دینے اور تنقیص کرنے کا موقع نہ پا سکیں۔ اگر داعی کسی جدید لفظ کے استعمال پر مجبور ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے جو مفہوم لینا چاہتا ہے اس کی وضاحت کردے، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں وہ مفہوم نہ آئے جو غلط ہے اور جو ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے یا لوگ اس کو سمجھتے ہیں۔

داعی کے لیے گفتگو کے آداب:

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سکون کے ساتھ بات کرے۔ چنانچہ اسے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ ٹھیر ٹھیر کر بات کرے تاکہ سامع اس کی بات کا احاطہ کرتے ہوئے اس کو سمجھ سکے۔ بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی بات کرتے تو اسے تین بار دہراتے تھے، تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔

داعی کو چاہیے کہ وہ گفتگو میں لفاظی، بڑے پن اور تکلف سے اجتناب کرے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ "تَنَطُّعْ کرنے والے ہلاک ہوئے۔"

یہ بات آپ ﷺ نے تین بار دہرائی۔ تَنَطُّعْ سے مراد یہ ہے کہ آدمی گفتگو میں تکلف اور لفاظی سے کام لے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَكُمْ مِّنِّیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَیْهِقُوْنَ۔

"مجھے تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھے سے دور وہ لوگ ہوں گے جو ثرثار، متشدق اور متفیہق ہوتے ہیں۔"

داعی کو اس بات سے اجتناب کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطب پر اپنی بڑائی جتائے اور کو حقیر جانے، اس کو چیلنج کرے اور اس کے اوپر اپنی فضیلت کا اظہار کرے۔

اس کو چاہیے کہ خیر خواہ اور شفیق، مخلص اور متواضع کے سے انداز میں اس سے بات کرے۔ ایسی بات جو دوسرے کو یہ احساس دلائے کہ اس کے لیے کیا چیز مفید ہے اور وہ اسے سمجھ جائے، داعی کو چاہیے کہ وہ اس مبلغ کی طرح بات کرے جس کو اللہ کی پیغام رسانی کا منصب حاصل ہے، نہ کہ اس شخص کی طرح جس کو خود کوئی فضل و کمال حاصل ہو۔

داعی کے لیے ان امور کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہو ان کا خیال نہیں رکھے گا تو اس کی بات اور مخاطب کے دل کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہوگا اور وہ داعی کی کوئی بات سن کر اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ بلکہ مخاطب اس سے متنفر ہوگا اور پھر وہ داعی کی کوئی بات نہیں سنے گا خواہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔

داعی کو چاہیئے کہ اس کی بات میں لطف ہو۔ وہ اپنے کلام اور خطاب میں ایسے خیالات کا چناؤ کرے جس سے مخاطب کا شوق اس کے سننے کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کے ذریعے مخاطب کے دل سے جہالت اور نفرت کے جذبات کا قلع قمع کردے۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جو اس لطف کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا [مریم ۱۹: ۴۲]

"انہیں ذرا اس موقعے کی یاد دلاؤ، جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا تھا: ابا جان! آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خطاب میں ابوّت کے رشتے کا ذکر کیا جس کی شان یہ ہے کہ یہ بچے کو باپ کی مصلحت کے لیے پریشان کر دیتا ہے اور باپ کو اس لائق

بنادیتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی بات کو غور سے سنے۔

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

[الاعراف ۷: ۶۵]

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کروگے؟"

چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو یا قوم کہہ کر مخاطب کیا، اس لیے کہ یہ خطاب اس قابل کہ مخاطب اس پر لبیک کہے۔ اس سے مخاطب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جو شخص اسے خطاب کر رہا ہے وہ نسب میں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

سنت نبوی میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں جو ہماری بات کی تائید کرتے ہیں۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ بنو کلب کی ایک وادی میں جو بنو عبداللہ کے نام سے جانے جاتے تھے، ان کے گھروں کے پاس گئے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا۔

یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ان سے کہا:

یَا بَنِیْ عَبْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَحْسَنَ اِسْمَ اَبِیْكُمْ۔

"اے بنو عبداللہ! اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کا نام بڑا اچھا رکھا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ تمہارے باپ کا نام اچھا ہے تو تمہارا جواب بھی اچھا ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

اس بنا پر داعی کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے خطاب میں مخاطبین کے جذبات کو اپنی اطاعت پر ابھارے، اس طرح کہ ان کو ان کی نسلی بہتری، خاندانی کرامت اور نسبی شرافت کی طرف متوجہ کیا جائے کہ ان امور کی بنا پر انہیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اللہ کے نافرمانوں کے ساتھ چلیں اور خواہشات ورذائل میں لت پت ہوں۔ ان کی شان یہ ہونی چاہیئے کہ وہ

بہترین لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان بردران کے ساتھ ہوں۔

اس طرح کا انداز اختیار کرنا۔ ان شاء اللہ۔ ممنوع نہیں ہوگا، اس میں ہمیں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ ہے کہ اس میں داعی مبالغہ نہ کرے اور اس طرز عمل کا مقصد شوق دلانا اور اطاعت پر آمادہ کرنا ہو، نہ کہ مداہنت اور نفاق اختیار کرنا۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

بات میں لطف پیدا کرنے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ داعی مداہنت اور نفاق کا شکار ہو جائے، یا یہ کہ وہ حق کو چھپائے یا باطل کی تحسین کرے، یا اس پر رضا مندی کا اظہار کرے، بلکہ اس کا مقصد صرف مخاطب کو حق کی قبولیت کے لیے آمادہ کرنا اور اس قبولیت میں اس کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ اس کا مطب یہ بھی نہیں ہے کہ داعی مخاطب کے مرض کو چھپادے۔ اس لیے کہ داعی کی مثال طبیب کی طرح ہے اور طبیب اپنے مریض سے اس کی بیماری کی علت اور علاج کی ضرورت چھپاتا نہیں ہے۔ یہی معاملہ داعی کا بھی ہوتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَاقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ۔ [ہود ۱۱: ۵۲]

"اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم رآسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ وقت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔"

حضرت صالح کے بارے میں اور انہوں نے اپنی قوم سے جو کچھ کہا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنَ، وَلَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ، الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ۔ [الشعراء ۲۶: ۱۵۰۔۱۵۲]

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرے۔"

گفتگو کی قسمیں:

ابلاغ دعوت کے حوالے سے گفتگو کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً خطاب، درس، لیکچر، مباحثہ، کسی اچھائی پر اُبھارنے اور برائی سے روکنے کے لیے بحث، خط وکتابت، جو اس اعتبار سے گفتگو ہی کے ضمن میں آتی ہے کہ یہ دعوت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اس کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو گفتگو کا ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب داعی کے لیے گفتگو ممکن نہیں ہوتی۔

ا۔ خطاب:

یہ ابلاغ دعوت کا ایک اچھا وسیلہ ہے۔ یہ ذریعہ عام طور پر وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں جنہیں داعی نہیں جانتا یا ان میں سے بعض کو جانتا ہے۔ کامیاب خطاب کے لیے شرط یہ ہے کہ داعی کے پاس کچھ متعین معلومات ہوں جنہیں وہ لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہے اور ان کی توجہ ان معلومات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ خطاب کا موضوع ایسا ہو جس کا لوگوں کے حالات کے ستھ بھی تعلق ہو اور اس کا سرا اسلامی عقیدے کے ساتھ بھی جاملتا ہو۔ مثلاً اگر وہ ایسے لوگوں کو خطاب کر رہا ہے جن میں قومی عصبیت پائی جاتی ہے تو اس کے سامنے بیان کرے کہ قومی عصبیت کے کیا نقصانات ہیں اور اس کے بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے۔ ایک مومن اگر اپنے رشتہ داروں کی مدد کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کا رشتہ دار ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ حق پر ہے۔ ایک مسلمان کو اسی چیز پر راضی ہونا چاہیے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ مسلمانوں کی اسلام اخوت کی لڑی میں پروجانا چاہیے اور جاہلی عصبیت کا قلادہ اپنے گلے سے اتار پھینکنا چاہیے۔ داعی کو چاہیے کہ اپنے خطاب میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھے:

ا: قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے استشہاد اور نبی کریم ﷺ، دوسرے انبیائے کرام اور صحابہ کی طرف سے ان کی عملی تطبیق کا ذکر۔ عملی تطبیق کے ذکر سے آیت اور حدیث کے معنی کھل کر سامنے آتے ہیں اور وہ ایک زندہ حقیقت بن جاتے ہیں۔

۲: کتاب وسنت میں مذکور قصص اور واقعات سے مدد لینا۔ اس میں کوئی حرج نہیں

ہے کہ افکار و معانی کو قصص اور ضرب الامثال کی شکل میں پیش کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: اَرَاَیْتُمْ لَوْ اَنَّ فِیْ بَابِ اَحَدِکُمْ نَهَرًا یَغْتَسِلُ فِیْهِ فِی الْیَوْمِ خَمْسَ مَرَّاتٍ اَیَبْقٰی مِنْ دَرَنِهٖ شَیْءٌ؟ اگر کسی کے گھر کے سامنے ایک نہر ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل رہ جائے گی؟ لوگوں نے کہا: نہیں، یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا: کَذٰلِكَ الصَّلَاةُ۔ نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

۳: خطاب مختصر ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ: اِنَّ طُوْلَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّةٌ مِّنْ فِقْهِهٖ فَاَطِیْلُوْا الصَّلَاةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ آدمی نماز لمبی اور خطبہ مختصر پڑھے تو یہ اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔ پس تم لوگ نماز لمبی اور خطبہ مختصر پڑھو۔

یہ حدیث خطبہ جمعہ کے سلسلے میں آئی ہے، مگر اس پر باقی خطبات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں لمبا خطاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

۴: خطابات زیادہ نہ ہو تاکہ لوگ اُکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو وائل شفیق بن سلمہؒ کہتے ہیں: حضرت ابن مسعودؓ ہر جمعرات کو ہمیں تذکیر کیا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! میں چاہتا ہوں کہ کاش آپ ہر روز ہمیں تذکیر کیا کریں۔ انہوں نے کہا: اس سے مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں تم لوگوں کو اُکتاہٹ سے دوچار کردوں۔ میں کبھی کبھار نصیحت کے ساتھ تم لوگوں کی تربیت کرتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھار ہماری تربیت کرتے تھے، اس خوف سے کہ ہم اُکتا نہ جائیں۔

۵: داعی کی بات سادہ اور واضح ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ جو لوگ اسے سنتے ہیں وہ خطاب کو سمجھنے میں علم اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک سطح پر نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب وہ سادہ اور واضح اسلوب اپنائے گا اور مختصر جملے استعمال کرے گا تو سب کو فائدہ ہوگا اور خطاب کو سارے لوگ سمجھیں گے۔

۶: داعی کے لیے مفید ہے کہ اپنے خطبے کا آغاز اس انداز سے کرے کہ لوگوں کے دلوں

میں اپنے رب کی یاد تازہ ہو۔ خطیب انہیں یہی کچھ بیان کرے اور انہیں اللہ سے ڈرائے۔ خطبے کا مقصد مقابلہ بازی نہ ہو، تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور کہیں کہ یہ تو بہت بڑا عالم اور بہت اچھا خطیب ہے۔ اصل مقصد دعوت الی اللہ کے معانی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ اگر ضرورت ہو کہ ایک بات جو اس نے ایک مقام پر بیان کی ہے وہ دوسری جگہ بھی بیان کردے تو اسے چاہیے کہ اس کا اعادہ کرے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی دعوت کا بار بار تکرار کرتے تھے۔ آپ ﷺ لوگوں سے کہتے تھے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمہارے جو معبود ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اسی طرح مسلمانوں کے سامنے خطبات میں نبی ﷺ تقویٰ اور آخرت کے لیے عمل کرنے کا اعادہ کیا کرتے تھے۔ خود قرآن کریم میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کئی بار دہرایا گیا ہے اسی طرح عقیدے کے بہت سے اصول اور معانی بھی بار بار دہرائے گئے ہیں۔

۷: خطیب کے لیے مفید ہے کہ اپنے خطبے کا آغاز کسی ایسی بات سے کرے جس سے لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہو جائے۔ مثلاً خطبے کے موضوع سے تعلق رکھنے والا کوئی حادثہ، کوئی قصہ، یا کوئی خیال جو اس کے دل میں آئے۔ جب لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جائے تو خطیب اپنا خطاب شروع کرے اور اس میں آہستہ آہستہ اور شوق بھرے انداز میں نصیحت ان کے گوش گزار کردے۔

۸: داعی کو چاہیے کہ اپنی فراست سے حاضرین کے دلوں اور ان کے ذہنوں میں جھانکے اور معلوم کرے کہ ان پر کون سی بیماری غالب ہے۔ نیز یہ کہ ان کو کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق بات کرے اور اس بیماری کا تعلق اسلامی عقیدے کے ساتھ جوڑے دے۔ مثلاً اگر ان کو ضرورت ہے کہ انہیں اس بات سے ڈرایا جائے کہ وہ شریعت کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اور اس میں جری ہوتے جارہے ہیں تو ان کے سامنے وہ آیات واحادیث بیان کرے جو اس مسئلے سے متعلق ہیں، ان کو لمبی لمبی آرزوئیں باندھنے سے روکے، اور انہیں کہے کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقت

آنے سے پہلے زاد راہ تیار کی جائے، اور زادراہ تقویٰ ہے۔ اللہ کے پاس جانے والے مسافر کے لیے یہ بہترین زادراہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ [البقرۃ۲: ۱۹۷]

"اور زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔"

ان کے سامنے بیان کردے کہ گناہ کی لذت، جو بہت مختصر ہوتی ہے، کہ بعد ندامت کی تلخی آنے والی ہے اور لمبے عرصے تک اس کی وجہ سے عذاب میں رہنا پڑھے گا۔ عقل مند وہ ہے جس نے کسی حرام چیز کی لذت سے اپنے آپ کو بچایا، اس مقصد کے لیے کہ حلال کی لذت سے لطف اندوز ہوسکے، جو دائمی ہے اور اس مختصر لذت سے بچ کر اس کی وجہ سے آخرت کی دائمی عذاب سے نجات پاسکے۔

اگر خطیب دیکھے کہ وہ جن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے، ان پر مایوسی اور نااُمیدی کا غلبہ ہے اور وہ رجوع الی اللہ کو مشکل سمجھ رہے ہیں تو وہ ان کو یہ تعلیم دے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہے۔ اور جو سچے دل سے توبہ کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ [الزمر۳۹: ۵۳]

اے نبی ﷺ ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں اس شخص کا قصہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ جس نے سو قتل کیے تھے کہ کس طرح ایک عالم نے اسے اللہ کی طرف رجوع اور ایک ایسی بستی میں جانے کا مشورہ دیا جس کے لوگ نیک اور صالح تھے۔

۹: داعی کو چاہیے کہ ان آیات اور احادیث کو بیان کرنے سے احتیاط کرے جنھیں عموماً لوگ سمجھ نہیں پاتے اور ان کو مفہوم سمجھنے کے لیے لمبی تشریح کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ حدیث کہ: مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

جس نے دل کے خلوص کے ساتھ لاالہ الا اللہ کہا، جنت میں داخل ہوگا۔

اگر یہ حدیث بیان کرنا ہو تو داعی کو چاہیے کہ اس کی پوری تشریح کر دے تاکہ لوگ اس کو صحیح طور پر سمجھ جائیں۔

۱۰: داعی کو چاہیے کہ جلدی جلدی گفتگو نہ کرے اور اس کی آواز بلا ضرورت اونچی نہ ہو۔

۱۱: بہتر یہ ہوگا کہ خطاب زبانی ہو، نہ کہ کاغذ سے پڑھ کر سنائے۔ چنانچہ تقریر کا مفہوم اس کے ذہن میں حاضر ہو، یعنی اس نے پہلے سے تیار کر لی ہو۔

۲۔ درس:

درس عموماً قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کی تشریح پر مشتمل ہوتا ہے، یا وہ فقہ کے کسی مسئلے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی طرح درس میں عموماً لوگوں کی ایک مختصر تعداد موجود ہوتی ہے۔ وہ اصل میں تو درس سننے کے لیے آتے ہیں مگر یہ داعی کے لیے ایک بہترین موقع ہوتا ہے کہ وہ قریب سے ان لوگوں کے ساتھ جان پہچان پیدا کرے اور اس کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرے۔

درس میں داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ موضوع کو پہلے خود اچھی طرح ذہن نشین رکھے اور اصل موضوع کو مختصر انداز میں پیش کرے۔ بات کو خواہ مخواہ لمبا نہ کرے، اس لیے کہ بات لمبی کرنے سے اصل موضوع سامع کے ذہن سے غائب ہو جاتا ہے اور وہ اُکتاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

تفسیر قرآن کے معاملے میں بہتر یہی ہے کہ خود قرآن کے ذریعے اس کی وضاحت کی جائے۔ اس لیے کہ قرآن نے اگر کسی بات کو ایک جگہ مجمل بیان کیا ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دیے۔ اگر کسی بات کی مزید وضاحت قرآن کریم میں نہیں ملتی تو سنت کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اگر حدیث کی تشریح بیان کرنی ہو یا فقہ کے کسی مسئلے کی وضاحت کرنی ہو تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ جو فقہی حکم اس کے نزدیک وزنی ہو وہ بیان کرے۔ مگر یہ اس وقت ممکن ہوگا جب کہ وہ فقہی اقوال میں تمیز کی قدرت رکھتا ہو اور ان میں سے وزنی اور غیر وزنی کو

معلوم کرسکتا ہو۔ اگر وہ یہ معلوم نہیں کرسکتا تو اسے چاہیے کہ کسی ایک مذہب کے مطابق جو حکم ہو وہ بیان کردے اور اسے مسئلے میں جو اختلافی آراہیں ان ذکر نہ کرے۔اس لیے کہ ان اختلاف کو ذکر کرنا سامعین کے ذہن کو منتشر کردے گا۔

۳۔ لیکچر:

لیکچر بالعموم کسی ایک موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں موضوع کے لیے جتنے دلائل ہیں ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع کے بارے میں اب تک جتنا کچھ کہا گیا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان اقوال میں جو بات درست ہو اس کا تعین کیا جاتا ہے۔

کامیاب لیکچر وہ ہوتا ہے جس کا ایک خاص اور متعین ہدف ہو، جسے بیان کرنے والا اس طرح واضح طور پر بیان کردے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور سامع مکمل طور پر قانع ہو جائے۔

کامیاب لیکچر دینے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے کلام میں باریکی سے کام لے اور اٹکل سے کام نہ لے۔ نیز وہ جذباتی الفاظ وکلمات پیش نہ کرے۔ جذبات کا مقام لیکچر نہیں بلکہ خطاب ہوتا ہے۔ لیکچر دینے والے کو چاہے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے سامعین کو اپنے ساتھ گفتگو میں شریک کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیدی گفتگو کرکے نتیجہ موضوع کے وہ مقدمات ان کے سامنے رکھے جن تک اپنی تحقیق کے دوران میں اس کی رسائی ہوئی ہے۔ اگر وہ ان مقدمات پر سامعین کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جائے تو ان کا نتیجے تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

لیکچر دینے والے کو چاہیے ہ وہ جس نتیجے تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کے لیے پہلے کچھ متعین مقدمات رکھے، اور وہ مقدمات ایسے مسائل پر مشتمل ہوں جو بالکل واضح اور مشہور ہوں۔

لیکچرار کو دقیق مسائل سے اور ایسے مشتبہ خیالات سے اجتناب کرنا چاہیے جن میں اخذ وقبول اور تردید دونوں کا امکان موجود ہو۔ اسی طرح وہ ایسے مسائل کو پانے لیے مقدمات نہ بنائے جو بذاتِ قبول ثبوت کے مستحق ہوں۔ مثلاً ان مسائل کو اپنے موضوع کے مقدمات کے طور پر پیش نہ کرے جسے موجودہ دور میں فلسفیانہ مسائل کہتے ہیں۔

اگر لیکچرار چاہتا ہے کہ بعض دینی حقائق، یا عقیدے کے اصول، جیسے بعث بعد الموت وغیرہ، تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا کہ وہ لوگوں کی نظر اس بات کی طرف متوجہ کر دے کہ ہم موت اور دوبارہ زندہ کیے جانے کا حیوانات اور نباتات میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو پھر انسان کو دوبارہ زندہ کیے جانے میں کیا رکاوٹ ہے۔ پھر اس حقیقت کو ان کے ذہنوں میں اور زیادہ راسخ کرنے کے لیے بعض مثالیں پیش کرے۔ یہی انداز قرآن کریم میں مذکور ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [حم السجدۃ ۴۱: ۳۹]

"اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے، پھر جوں ہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ حیات بعد الموت تو ایک دیکھی بھالی حقیقت ہے۔ زمین مردہ ہوتی ہے، اس میں کوئی سبزہ نہیں ہوتا، نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر بارش نازل کر دیتا ہے تو وہ زمین پھول جاتی ہے اور اس میں سے زندہ نباتات پیدا ہوتے ہیں، جن کے مختلف رنگ اور مختلف ذائقے ہوتے ہیں۔

یقیناً وہ اللہ جس نے اس زمین کو موت کے بعد زندہ کیا وہی مردوں کو بھی موت کے بعد زندہ کرے گا، کیوں کہ اسی نے ان کو نطفے کے ایک بوند پانی سے پیدا کیا تھا۔ یہ بوند جسے ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اور یہ بات معلوم و محسوس ہے کہ دوسری مرتبہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ [یٰسٓ ۳۶: ۷۸-۷۹]

انسان اب ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے:

کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔ اس سے کہوں انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہوں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

یہ تو ہوئی لیکچر کی عمومی حیثیت، مگر ایک مسلمان داعی کا لیکچر بالکل خشک بھی نہیں ہوتا، بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے لیکچر میں عقلی اور وجدانی طور کچھ ایسی تحریک پیدا کرے جو اسے اسلام کے حقائق اور اسلامی عقیدے کی تعلیمات کی طرف متوجہ کر سکے۔ یہ وجدانی تحریک مسلمان کے دل میں موجود ایمانی جذبے کو اُبھارنے سے پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ مباحثہ و مناظرہ:

مباحثہ اور مناظرہ دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔ داعی جب کسی کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو بعض اوقات مخاطب اس کی بات کو قبول نہیں کرتا اور وہ داعی کے ساتھ مباحثہ اور مناظرہ کرتا ہے۔ قرآن کریم نے مباحثے کی بعض صورتیں ذکر کی ہیں۔ جو انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے درمیان پیش آئے تھے۔ انہی میں ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ قَالَ یَا قَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَۃٌ وَّلٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَکُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ

[الاعراف ۷: ۵۹۔۶۳]

"ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوحؑ نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات

پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ، اور تم پر رحم کیا جائے۔"

مدعو جب اپنے داعی کے ساتھ مباحثہ اور مناظرہ کرتا ہے تو کبھی کبھی وہ داعی پر الزام تراشی کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ صریح گمراہی میں مبتلا ہے۔ مدعو کی یہ گمراہی اسے حیرت زدہ نہیں کر سکتی اور نہ اسے اپنے وقار اور سکون سے خارج کر دیتی ہے۔ وہ پھر بھی اپنے مدعو کو پورا وزن دیتا ہے، اس کے ساتھ شفقت کرتا ہے، جیسا کہ حضرت نوحؑ کے جواب سے واضح ہے۔ داعی کو چاہیے کہ ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھے اور اپنے مباحثہ اور مناظرہ کی گفتگو میں بہترین انداز اختیار کرے، پاکیزہ کلام کرے، اور پورے ادب کو ملحوظ رکھے، تواضع اور سکون سے کام لے اپنی آواز اونچی نہ کرے اور مد مقابل کو نہ غصہ دلائے اور نہ اس کا مذاق اڑائے۔ وہ مخاطب کے ساتھ اپنی گفتگو بلند اور اعلیٰ سطح پر رکھے اور اس کے ساتھ نرمی وشفقت جاری رکھے، اپنی گفتگو کو سختی اور خشونت سے خالی رکھے، مگر اس میں مخاطب کو مطمئن کرنے کی قوت موجود ہو اور اس سے حق کھل کر نمایاں ہو جائے۔

یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہیں:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

[النحل ۱۶: ۱۲۵]

"اے نبی ﷺ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔"

پھر اگر مخاطب اپنے باطل موقف پر اصرار کرتا ہے، ضد میں آتا ہے اور اس کے ساتھ مزید گفتگو کا فائدہ نہیں ہوتا تو داعی کو چاہیے کہ اس کے ساتھ مباحثہ چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھے:

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ [یونس ۱۰: ۱۰۸]

"اے محمد ﷺ! کہہ دو کہ لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف حق آچکا

ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے، اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہو۔"

نیز یہ کہ: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [الکہف ۱۸ : ۲۹]

"صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔"

ایسے لوگوں کے ساتھ مباحثہ ترک کرنا ایک درست طریق کار ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کے ساتھ مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ مباحثے کے ذریعے حق تک رسائی نہیں چاہتے بلکہ ان کا مقصد اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا، اور ضد وعناد ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ

[الانعام ۶ : ۷]

"اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔"

۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عموماً زبان سے ہوتا ہے۔ غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینا اسی قسم کی چیز ہے۔ اسی طرح ایک گناہ گار مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دینا اور اسے شریعت کی خلاف ورزی سے روکنا بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔

اس کے علاوہ ان تمام قسم کے اوامر ونواہی کا رخ کبھی ایک فرد کی طرف ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زائد افراد یا لوگوں کی ایک پوری جماعت کی طرف، یا بالعموم سارے انسانوں کی طرف۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان احکام کی پیروی کریں جنہیں اسلام لے کر آیا ہے اور اس اشیا سے باز رہیں جو اس کے برخلاف ہیں۔ اس سلسلے میں چند جامع قواعد جنہیں داعی کو سمجھنا چاہیے درج ذیل ہیں:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قواعد

۱۔ علم:

جس معروف کی طرف داعی حکم دیتا ہے اور جن منکر سے وہ روکتا ہے اس کا علم ضروری ہے سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی کرے جو فقیہ ہو، اس معروف کا جس کا وہ حکمدے رہا ہے اور اس منکر کا جس سے وہ روکتا ہے"۔ یہ بات واضح ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ جو شخص کسی مریض کا علاج کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ بیماری کو بھی سمجھے اور علاج بھی معلوم ہو۔ مطلبیہ ہے کہ وہ اچھا طبیب ہو۔ اسی طرح داعی کا معاملہ ہے یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہے کہ:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ [یوسف ۱۲: ۱۰۸]

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھ بھی۔"

ہم نے جو بات کہی ہے وہ بصیرت کے ضمن میں آتی ہے۔

۲۔ نرمی:

اس کی بنیاد بھی کتاب وسنت ہے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى، فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى [طٰہٰ ۲۰: ۴۳۔۴۴]

"جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے، یا ڈر جائے۔"

نرم بات کہنا، جس کی طرف اس آیت کریمہ نے اشارہ کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نازعات میں بھی ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى۔ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى۔

[النازعات ۷۹: ۱۷۔۱۹]

"فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہوگیا ہے، اور اس سے کہہ: کیا تو اس کے لی تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اُس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟"

یہ خطاب حق کو صراحت کے ساتھ بیان کر رہا ہے مگر اس میں نرمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مخاطب اپنے دل میں، جو باطل کے ساتھ گراں بار ہوتا ہے، کوئی اُبھار محسوس نہیں کرتا۔

پھر خطاب میں نرمی اس حد آگے بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے واقعہ بیان کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی [طٰہٰ ۲۰: ۴۷]

"ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔"

یہ فرعون کو ڈرانے کا ایک سچا اور لطیف انداز ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عذاب کی بات براہِ راست فرعون کی طرف منسوب نہیں کی، بلکہ فرمایا: عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی یعنی عذاب اس کے لیے ہے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

اس میں ڈراوے کا جو لطیف انداز اور جو نرمی پائی جاتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نرمی کا حکم دیا ہے، حالانکہ آپ علیہ السلام معصوم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی حفاظت کی ہے، تو دوسرے داعیوں کے لئے نرمی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اب کوئی بھی داعی موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں ہوگا اور اس کا مخاطب فرعون سے زیادہ برا نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

مَاکَانَ الرِّفْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ وَلَا کَانَ الْعُنْفُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ۔

"جس چیز میں بھی نرمی کی جاتی ہے وہ خوب ہوتی ہے اور جس چیز میں بھی شدت سے کام لیا جاتا ہے وہ خراب ہو جاتی ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُّحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ وَیُعْطِیْ عَلَیْہِ مَالَا یُعْطِیْ عَلَی الْعُنْفِ۔

"اللہ تعالیٰ نرم ہے اور ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی کے ساتھ وہ کچھ دیتا ہے جو سختی کے ساتھ نہیں دیتا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں جو نرمی ہو وہ اس رفق میں داخل ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ داعی بعض اوقات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس نرم طریق کار سے نکل جاتا ہے۔ مگر اس کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس بات کے لیے آمادہ رکھے۔ اس لیے کہ یہی وہ درست طریق کار ہے جس کی طرف سنت نبوی نے رہنمائی کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی کر دکھایا ہے۔

ان عملی نمونوں میں سے ایک وہ ہے جو حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس دوران لوگوں میں سے کسی نے چھینک ماری تو میں نے کہا: یرحمک اللہ یہ سن کر لوگوں نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: بھئی کیا ہوا؟ میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ لوگ مزید پریشان ہوئے اور وہ اپنے رانوں پر ہاتھ مار کر مجھے خاموش کرنے لگے۔ میں خاموش ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب نماز مکمل کی، میرے والدین آپ ﷺ پر قربان ہوں، میں نے آپ ﷺ کی طرح معلم نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا ہے، واللہ! آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا۔ آپ ﷺ نے صرف اتنا فرمایا:

اِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يُصْلِحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، اِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ۔

"یہ نماز ہے، اس میں انسانی باتیں درست نہیں ہیں۔ اس میں صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن تلاوت ہوتی ہے۔"

۳۔ مصلحتوں پر نظر:

اس سے مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اس بات کی گہری سمجھ اور بصیرت رکھتا ہو کہ کون سی بات مصلحت پر مبنی ہے اور کون سی نہیں، اور ہو کس

بات پر قادر ہے اور کس بات پر قادر نہیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے، اگر اس کے بارے میں مصلحت اور فساد کا آپس میں مقابلہ ہو تو وہ دیکھے، اگر صورت حال یہ ہو کہ اس کی بات میں پائے جانے والے فوائد اُس خرابی سے زیادہ ہوں جو دعوت نہ دینے کی صوت میں درپیش ہوتی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ امر بالعروف اور نہی عن المنکر کرے، لیکن اگر معاملہ الٹ ہو، یعنی دعوت دینے کا نقصان دعوت نہ دینے کے نقصان سے زیادہ ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے، بلکہ کبھی تو حرام ہوتا ہے۔

۴۔ معروف اور منکر کا ملاپ:

داعی معروف کی مختلف قسموں کے بارے میں مطلقاً دعوت دے، اور سی طرح منکر کی تمام قسموں کے بارے میں میں مطلقاً نہی کرے۔ مگر جب کسی خاص فرد یا گروہ کا معاملہ درپیش ہو جس میں معروف بھی پایا جاتا ہے اور منکر بھی، تو اس کی دو صورتیں بنتی ہیں: یا تو وہ معروف اور منکر دونوں کو کرتے ہوں گے یا دونوں کو چھوڑتے ہوں گے۔ داعی کو چاہیے کہ غور کرے، اگر معروف کا فائدہ زیادہ ہے، جس کا وہ حکم دے رہا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کا حکم دے، اگرچہ وہ فرد یا گروہ کسی منکر میں بھی مبتلا ہو، جسے بہت سے معروفات نے ڈھانپ رکھا ہو۔ اسی طرح اگر منکر کا نقصان معروف کے فائدے سے زیادہ ہے تو داعی کو چاہیے کہ اپنے مخاطب کو اس سے روکے، اگرچہ اس کی وجہ سے امر بالمعروف نہ کرنے کی بنا پر کسی بھلائی سے محروم ہونا پڑے جو برائیوں سے ڈھکی ہوئی ہو۔ اگر داعی کے سامنے معاملہ اس سے بھی زیادہ مشتبہ ہو جائے تو پھر اس کی چاہیے کو توقف کرے، یہاں تک کہ اس کے سامنے معاملہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ وہ جو بھی قدم اُٹھائے، علم کے ساتھ اٹھائے اور اپنی نیت خالص رکھے۔

۵۔ ابلاغ بقدر امکان:

فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے یہ بات شرط نہیں ہے کہ داعی کی بات دنیا کے ہر مکلّف انسان تک پہنچے۔ اس لیے کہ یہ رسالت کی تبلیغ کی شرائط میں بھی داخل نہیں ہے، تو جو چیز رسالت کے قائم مقام ہے اس میں یہ بات کیسے شرط قرار دی جاسکتی ہے۔ بلکہ شرط یہ ہے کہ

مکلّف لوگ اس بات کے امکانات پیدا کریں کہ حق ان تک پہنچ سکے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرتے ہیں اور وہ اس بات کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے کہ حق ان تک پہنچ سکے، باوجودیکہ کچھ لوگ اس کام کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنا فریضہ ادا کرے رہے ہیں۔ اس صورت میں کوتاہی لوگوں کی ہوگی، نہ کہ داعی کی۔

۶۔ خط وکتابت اور تحریر:

خط وکتابت اور تحریر، جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، دعوت الی اللہ کے معاملے میں قول اور گفتگو کی ایک قسم شمار ہوتی ہے۔ اس میں یا تو ان لوگوں کو خطوط لکھنا ہوتا ہے جن کو داعی اسلام کی طرد عت دینا چاہتا ہے اور اسلام مخالف امور کو اس سے چھڑانا چاہتا ہے، یا پھر لکھنے اور تحریر کا ہدف کتابیں تالیف کرنا اور مختلف مجلات کے لیے علمی و تحقیقی مقالات ومضامین لکھنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں دعوت الی اللہ کے بہت اچھے ذریعے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے تھے کہ غیر مسلم ممالک کے حکمرانوں کے نام خطوط لکھیں۔ ان میں آپ ﷺ لوگوں کو اللہ کی طرف اور اسلام کو قبول کرنے کی طرف عوت دیتے تھے۔ جیسے آپ ﷺ نے عراق اور ایران کے بادشاہ کسریٰ، شام کے ہرقل اور مصر کے مقوقس کے نام خطوط ارسال کیے۔

علمائے اسلام کا بھی یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ مسلمان حکمرانوں کو خطوط لکھتے تھے۔ ان میں وہ حکمرانوں کو ان امور کی دعوت دیتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم کیے ہیں۔ اس کی ایک مثال امام ازاعی کا وہ خط ہے جو انہوں نے شام میں عباسی حکمران کو ذمیوں کے بارے میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ذمیوں کے جائز حقوق کا خیال رکھا جائے۔

اس کے علاوہ اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتابیں لکھنا تحقیقی مضامین اور مقالات تحریر کرنا دعوت الی اللہ کا ایک مفید ذریعہ ہے۔ خصوصا جب انہیں ایسی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے جن کو اسلام سے متعارف کرانا اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دینا پیش نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے لاکھوں ایسے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا ممکن ہو جاتا ہے جو عربی زبان نہ

جانتے ہوں اور جن تک اسلامی تعلیمات نہ پہنچی ہوں۔

کتابوں اور مقالات کے لکھنے میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ان کا خطاب عمومی ہو اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں، اگرچہ علم و فہم کے لحاظ سے ان کی سطحیں مختلف ہوں۔

چنانچہ داعی کو چاہیے کہ کتابیں اور مقالات سادہ انداز میں لکھے۔۔ ان کا مفہوم واضح ہو، یہاں تک کہ اسے وہ لوگ بھی سمجھ سکیں جن میں بات کو سمجھنے کی صلاحیت کمزور ہو۔

داعی اپنی کتاب یا مقالے میں جو خیالات پیش کرتا ہے وہ ایسے ہوں کہ اگر کوئی انسان اسلام کو قبول کرنا چاہتا ہے، تو وہ ان تعلیمات سے منہ نہ موڑ سکے۔ داعی کی کتابیں دقیقی اختلافی مسائل سے پاک ہونی چاہییں، ان میں اختصار پیش نظر رہے اور اس میں معانی کے لحاظ سے یا فہم کے تقاضوں کے لحاظ سے کوئی خرابی نہ ہو۔

عمل کے ساتھ ابلاغ دعوت

عمل سے مراد:

یہاں پر ابلاغ دعوت کے معاملے میں عمل سے ہماری مراد عملی طور پر منکر کا ازالہ کرنا ہے۔ اور عموماً ہوتا بھی یہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ عمل میں منکر کا ازالہ نہ ہو، بلکہ کسی منکر کا قیام اور نفاذ ہی مقصود ہو۔ جیسے مسجد و مدرسہ وغیرہ کی تعمیر جس میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کی اقامت کے لیے کام کیا جاتا ہے یا اس کے لیے تیاری کی جاتی ہے۔ یہ اسلام کی طرف ایک خاموش دعوت ہوگی اور یہ دعوت الی اللہ کی اشاعت کا ایک فعال اور موثر ذریعہ ہوگا۔

منکر کو ختم کرنے کی بنیاد:

منکر کا ازالہ کرنے کی اصل بنیاد رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے بدل ڈالے۔ اور یہ ایمان کا کمزور

ترین درجہ ہے۔"

منکر کا عملاً ازالہ ایک ایسی چیز کا ازالہ ہے جو بھلائی یا حق کے راستے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر زمین میں کوئی منکر موجود ہو تو وہ اپنے برابر یا اس سے بھی زیادہ حق کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔ چنانچہ اس کو زائل کرنا یا اس کا زائل ہونا بھلائی اور حقکو لوگوں کے لیے آسان بنانے کی خاطر ہوگا۔ چنانچہ یہ بھی امر بالمعروف کی تکمیل بلکہ اسی کا ایک پہلو ہے۔

منکر کا ازالہ کرنے کے عمومی قواعد:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم نے عمومی قواعد کا ذکر کیا ہے، وہی قواعد یہاں بھی جاری ہوتے ہیں۔ منکر کا ازالہ کرنے کے لیے اس چیز کا علم اور اس کا فہم ضروری ہے جس کا داعی ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح منکر کا ازالہ کرنے میں بھی نرمی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اصل مقصود یہ ہے کہ منکر کا ازالہ ہو جائے کسی کو سزا دینا یا کسی سے انتقام لینا مقصود نہیں ہے۔

بخاری میں ایک روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کیا۔ لوگ اس کی پٹائی کرنے کے لیے اُٹھے، مگر نبی ﷺ نے فرمایا:

دَعُوْهُ وَاَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهٖ سِجْلًا مِّنْ مَّاءٍ اَوْ ذَنُوْبًا مِّنْ مَّاءٍ ، فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ۔

"اسے پیشاب کرنے دو، اور (بعد میں) اس پر ایک ڈول پانی ڈال دو۔ تم آسانی پیدا کرنے والے ہو، نہ کہ سختی اور تنگی لانے والے۔"

داعی پر لازم ہوگا کہ منکر کا ازالہ کرنے کے لیے اقدام کرنے سے پہلے وہ فوائد اور نقصانات کا جائزہ لے اور ان کے درمیان مقابلے کی صورت بھی ملاحظہ کرے۔ اس طرح داعی کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ازالہ کرنے سے کیا اچھے یا برے نتائج برآمد ہوں گے۔ اسی طرح وہ کسی شخص میں معروف اور منکر کے ملاپ کی وہ صورت بھی دیکھے جو چوتھے قاعدے میں بیان ہو چکی ہے۔ وہ شخص یا تو معروف اور منکر دونوں کام کرتا ہوگا یا دونوں کو ترک کرتا ہوگا۔ حالانکہ معروف کو کرنا چاہیے اور منکر سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ داعی دیکھے کہ اس

متعین شخص کے بارے میں منکر کے ازالے سے کیا فائدہ یا نقصان ہوگا۔ یہاں ہم ان عمومی قواعد کے علاوہ منکر کا ازالہ کرنے کے بارے چند مزید قواعد کا اضافہ کرتے ہیں:

ا۔ ازالہ منکر کی قدرت:

پہلی بات یہ ہے کہ منکر کا ازالہ کرنے والے میں اتنی قدرت ہو جو منکر کا ازالہ کر سکے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قدرت کے لحاظ سے داعیوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اس کی سب زیادہ قدرت حکمران کو ہوتی ہے، یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اور جو امر و نہی کے اختیارات کا مالک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر میں منکر کا ازالہ کرنے کے سلسلے میں وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جواب دہ ہے۔ اس لیے کہ وہ شرعی طور پر اس کام پر مامور ہے کہ وہ یہ ازالہ کرے گا، اور اس کو اپنے گھر میں ولایت حاصل ہے اس لیے وہ اس ازالے پر قادر بھی ہے۔ یہی وجہ کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

البتہ اگر منکر کی بعض جزئیات میں کوئی چیز شرعی طور پر اس ازالے کے بالمقابل آجائے، اس لحاظ سے کہ اگر داعی اس جزوی خرابی کو دور کرتا ہے تو اس سے دوسری طرف ایسا نقصان ہوگا جو حاصل کیے جانے والے فائدے سے بہت زیادہ ہوگا، تو جیسا کہ سابقہ قواعد میں کہا گیا ہے اس منکر کا ازالہ درست نہیں ہوگا۔

اگر داعی میں منکر کا ازالہ کرنے کی قدرت نہیں ہے، یا ازالہ تو وہ کر سکتا ہے مگر اس سے زیادہ بڑا منکر لازم آتا ہے، یا اس سے کوئی عظیم نقصان واقع ہونے کا خدشہ ہے۔ چنانچہ دعوت الی اللہ میں اس کا عملی اقدام معطل ہوگا اور داعی زبان کے ساتھ ازالے کی طرف منتقل ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو جیسا کہ مذکورہ حدیث میں آیا ہے، داعی اس سے بھی نیچے آکر دل سے بدل ڈالنے کی طرف رجوع کرے گا۔

اس قاعدے کے عملی نمونوں میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو کچھ نہیں کہا تھا، اس لیے کہ مدینہ میں اس کے بہت سے حمایتی موجود تھے۔ کیوں کہ اسے سزا دے کر اس کے منکر کا ازالہ کرنے سے ایک بڑے معروف سے

بھی ہاتھ دھونا تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کی قوم کے لوگ جن میں سے بعض سچے مسلمان تھے، خصوصاً اس کا بیٹا اس حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی ناراض ہو جاتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ لوگ سنیں گے تو وہ اصل حقیقت سے بے خبر ہو کر یہی خیال کریں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

۲۔ منکر سے نفرت اور اس کا ازالہ بقدرِ وسعت:

یہ بات بھی اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ منکر سے نفرت کامل اور مکمل ہونی چاہیے اس لیے کہ مسلمان کے بارے میں اصل تصور یہی ہے کہ اس کی محبت اللہ کی محبت کے موافق ہونی چاہیے اور اس کا بغض اس چیز کے ساتھ ہونا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔

اس موافقت میں کسی بھی قسم کی کمی، خواہ ایک جانب سے ہو یا دونوں طرف سے، قطعی فور پر ایمان کا ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ دل میں منکر کو ناپسند کرنا ایک ایسا امر ہے کہ اس میں کسی قسم کا ضرر نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی یہ بھی نہیں کرتا کہ وہ منکر کے ساتھ دل میں نفرت کرے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کے ایمان میں ضعف ہے۔ بلکہ اس کا دل مردہ ہے اور اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس حدیث میں منکر کو ہاتھ اور زبان سے روکنے جیسے ایمان کے مختلف مراتب کا ذکر ہے، اس کے آخر میں ہے کہ لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔ "اس کے بعد ذرہ برابر ایمان بھی نہیں ہے۔"

ہاتھ سے منکر کا ازالہ یعنی عملی طور پر اس کے خلاف اقدام کرنا انسان کی قوت اور قدرت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ [التغابن ۶۴: ۱۶]

"جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔"

جب دل میں منکر کے ساتھ نفرت کامل ہو اور اس کو بدل ڈالنے کا ارادہ پختہ ہو اور مسلمان اس کے خلاف اپنی وسعت کے مطابق کوشش کرے، یا عاجز ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی کام نہ کر سکے تو اس کا ثواب ضرور اسے ملے گا۔

۳۔ ازالۂ منکر کے لیے مباح اُمور کا سہارا لینا:

اس کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگوں کی تالیف قلب کرنا مشروع قرار دیا گیا ہے، تاکہ لوگ خیر کی طرف آگے بڑھیں اور برائی سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے لوگوں کو مالی عطیات بھی دیے جاسکتے ہیں۔ امام وفقیہ (اور پانچویں خلیفہ راشد) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: خدا کی قسم، میں لوگوں کے لیے دین کا کوئی حکم نہیں دے سکتا، جب تک کہ اس کے ساتھ کچھ دنیوی پہلو بھی ان کے سامنے پیش نہ کروں، اس کے ذریعے میں لوگوں کے دلوں میں نرمی پیدا کرتا ہوں، کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ ان کی طرف سے مجھ پر ایسی چیز پھٹ پڑے گی جس کی طاقت مجھ میں نہیں ہوگی۔

اس وجہ سے داعی کے لیے جائز ہے کہ جو شخص کسی برائی میں مبتلا ہے اس کو کوئی جائز دنیوی عوض بھی فراہم کرے۔ یہ اس کے لیے برائی کو چھوڑنے یا اسے بدل ڈالنے کا بدلہ ہوگا۔

مثلاً کسی کا کوئی بیٹا یا کوئی دوست جوا کھیلتا ہے تو وہ جوئے سے روکنے کے لیے اسے کوئی انعام دے دیتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کسی مباح کام مثلاً گھڑ سواری یا نشانہ بازی کا مقابلہ جیتنے، یا کسی ایسی چیز کے یاد کرنے پر کسی کو انعام دیا جائے، جس کا یاد کرنا مستحب ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص فحش کتب اور رسائل پڑھنے کے منکر میں مبتلا ہے تو اسے پاکیزہ کتابیں دی جائیں، یا کوئی شخص رشوت کا عادی ہے، یا دوسرے کا مال لے کر کھانے میں تساہل سے کام لیتا ہے تو اس کی اجرت میں اضافہ کیا جائے، اور اس طرح کے دوسرے امور۔

اچھے کردار سے ابلاغ دعوت

اچھے کردار کی اہمیت:

دعوت الی اللہ اور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے ذرائع میں سے بہترین ذریعہ داعی کا پاکیزہ کردار، اس کے قابل تعریف افعال، اعلیٰ صفات اور بلند اخلاق ہے۔ یہ چیزیں داعی کو دوسروں کے لیے بہترین نمونہ اور خوب صورت اسوہ بنا دیتی ہیں۔ ان کی بنا پر داعی کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے جس میں لوگ اسلامی تعلیمات کو پڑھ سکتے

ہیں، اس طرح وہ ان تعلیمات کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس لیے کہ افعال اور کردار کا اثر صرف باتوں کے اثر سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

دنیا کے اکثر ممالک میں اسلام کی اشاعت مسلمانوں کی پاکیزہ سیرت و کردار سے ہوئی، وہ کردار جو غیر مسلموں کی نگاہیں اپنی طرف کھینچتا اور انہیں اس بات پر آمادہ کرتا تھا کہ وہ اسلام کو گلے لگالیں، داعی اپنی پاکیزہ سیرت کے ذریعے جو اسوہ حسنہ پیش کرتا ہے وہ دراصل اسلام کی علمی دعوت ہوتا ہے، جس سے غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر استدلال کرتے ہیں اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہو دین ہے یہ تاثر خاص طور پر ان غیر مسلموں کا ہوتا ہے جو سلیم الفطرت اور سلیم العقل ہوتے ہیں۔

داعی کے اچھے کردار کی اہمیت اور وہ جس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے اس پر لوگوں کے ایمان لانے میں داعی کے کردار کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کو جب رسول اللہ ﷺ نے غار حرا میں پیش آمدہ واقعے کی اطلاع دی تو انہوں نے کہا آپ کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، آپ گراں بار کے سوار ہونے میں تعاون کرتے ہیں اور حوادث زمانہ کے مقابلے میں مدد دیتے ہیں۔

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح کے گئی اچھے اخلاق کا ذکر کیا، جن کی بنا پر وہ آپ ﷺ کی تصدیق اور حق میں آپ ﷺ کی اعانت پر کمر بستہ ہو گئیں۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم کون ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں محمد بن عبد اللہ ہوں۔ آدمی نے کہا: کیا تم وہی ہو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں وہی ہوں جس کے بارے میں لوگوں کا یہ گمان ہے۔ دیہاتی نے کہا: یہ چہرہ کسی جھوٹ کا چہرہ نہیں۔ پھر اس نے کہا: تم کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے چند اسلامی تعلیمات بیان کیں، جس کی طرف آپ ﷺ دعوت دیتے تھے۔ دیہاتی نے کہا: میں تجھ پر ایمان لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کا رسول ہے۔ اس

سے معلوم ہوا کہ دیہاتی نے آپ کے چہرہ انور کے ان نشانات سے، جو سچے اور بااخلاق لوگوں میں پائے جاتے ہیں، اس بات پر استدلال کیا کہ آپؐ اپنی دعوت میں سچے ہیں۔

اچھے کردار کے اصول:

اچھا کردار، جس کے ذریعے داعی دوسروں کے لیے اچھا نمونہ ثابت ہوتا ہے، اس کے دو بڑے اصول ہیں: ایک اچھے اخلاق اور دوسرا قول و فعل کی موافقت۔ اگر یہ دونوں اصول موجود ہوں تو داعی کی سیرت و کردار اچھی ہوگی اور اس کا کردار اسلام کی طرف خاموش دعوت ہوگا۔ لیکن اگر داعی میں یہ دونوں امور موجود نہ ہوں تو اس کی سیرت بری ہوگی اور یہ اس بات کی خاموش دعوت ہوگی کہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ اس لیے داعی کو اس اہم ترین معاملے میں اللہ کا خوف کرنا چاہیے اور اسے اپنی سیرت کی وجہ سے دوسروں کو دین سے متنفر نہیں کرنا چاہیے، حالانکہ داعی چاہتا یہ ہے کہ لوگوں کو دین کی طرف بلایا جائے۔

ا۔ اچھے اخلاق:

اچھے کردار کا پہلا اصول اچھے اخلاق ہے۔ پہلے ایک فصل میں ہم نے اسلام کے نظام اخلاق کے بارے میں بحث کی ہے۔ نیز ایک جگہ ہم نے داعی کے اخلاق بھی بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہاں ہم ان سارے مباحث کا اعادہ نہیں کریں گے۔ یہاں صرف صبر اور عفو و درگزر کی صفات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اذیتوں کے مقابلے میں بردبار اور صابر ہو۔ اس لیے کہ داعی کو اذیتوں اور مشکلات کا سامنے ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اگر داعی حلم اور صبر سے کام نہیں لے گا تو امام ابن تیمیہؒ کے بقول: "یہ اصلاح سے زیادہ فساد کرے گا"۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ [الاعراف ۷: ۱۹۹]

"نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے منہ موڑ لو۔"

لقمانِ حکیم نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی تھی اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

[لقمان ۳۱: ۱۷]

"نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کے امام ہیں، صبر کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ [الاحقاف ۴۶: ۳۵]

"صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔"

بلکہ یہاں تو صبر کو رسالت کے ابلاغ کے ساتھ متصلاً ذکر کیا گیا ہے، جو اس کی اہمیت اور داعی حق کے لیے اس کے لازمی ہونے کی دلیل ہے، رسول اللہ ﷺ پر اقرا کے بعد پہلی وحی یہ نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ [المدثر ۷۴: ۱-۷]

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اُٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو، زیادہ احسان کرنے کے لیے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔"

ان آیات کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچاؤ۔ اور اختتام صبر پر ہوتا ہے۔ انداز اور ڈرانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد صبر واجب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ داعی اپنے عفو درگزر جاہلوں سے اعراض اور ان کی اذیتوں پر صبر سے وہ نتائج حاصل کرتا ہے، جو ان صفات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ داعی کی صفات مخاطبین کو لازمی طور پر قبول حق پر آمادہ کرتی ہیں، اگرچہ اس میں کچھ وقت لگ جاتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جن پر تقدیر غالب آجاتی ہے۔ اس لیے کہ برائی سے روکنا

اور بھلائی کی قوت دینا بھی اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

۲۔ قول و فعل میں مطابقت:

اچھے کردار کا دوسرا اصول قول و فعل میں مطابقت ہے۔ داعی کو اس بات سے بھی محتاط رہنا چاہیے کہ اس کے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ یہ فطری بات ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عملی نہیں کرتا اس کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ [ہود ۱۱: ۸۸]

"اور میں ہر گز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ ہمارے افعال ہمارے اقوال کے خلاف ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ [الصّف ۶۱: ۲۔۳]

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔"

داعی کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ رکھے کہ اس کے افعال اس کے اقوال کے مطابق ہوں۔ یہ چیز لوگوں کے، اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی بات کو قبول کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

باب:۱۲

عام معاملات

دعوت کی راہ میں ایک داعی کو مختلف قسم کے سوالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کا جواب داعی کو بغیر سوچے سمجھے جلد از جلد دینا ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں بھی داعی کو ہوشیار رہنا چاہیے۔اسے اپنی ذمہ داریوں کو جو اس پر اللہ اور بندوں کی جانب سے واجب ہوتی ہیں ان کا احساس کرنا چاہیے اور کسی چیز کے بارے میں بغیر علم کے کچھ کہنے سے گریز کرنا چاہیے۔

سوالات وجوابات:

یہاں کچھ لطیف نمونے کے سوالات ان کے جوابات کے ساتھ نقل کئے جارہے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سوالات کے جوابات جو ہمارے پاس ہیں ان سے ہر شخص کو اختلاف رائے کرنے کی آزادی ہے۔ایک داعی کو میدان عمل میں لوگوں کی طرف سے اکثر ایسے ہی سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔داعی کو عام طور پر پوچھے جانے والے مسائل ومعاملات کے متعلق شریعت کا بھرپور مطالعہ اور علم رکھنا چاہیے تاکہ وہ بروقت سائل کو مطمئن کرکے اپنی دعوت کو موثر انداز میں پیش کرسکے۔چند سوالات بمعہ جوابات بطور نمونہ کچھ یوں ہیں:

الف۔ عادات اور احکام سے متعلق سوالات :

سوال: سنت پر عمل کرتے ہوئے ہم اپنی داڑھیاں بڑھائیں یا زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے ان کو کٹوائیں؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مونچھیں کٹاؤ اور داڑھی بڑھاؤ یہود کی مخالفت کرو۔" [بخاری: کتاب اللباس]

سلف صالحین کے عمل سے بھی یہی ثابت ہے اور یہ اس وقت سے ہے جب سے اسلام کا آغاز ہوا۔ بعض فقہاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ سنتیں جو عبادات سے متعلق ہیں دوسری وہ جو رسم ورواج سے یعنی عادات سے متعلق۔

رسم ورواج کی سنتوں کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی رسوم ورواج اور اسلامی عادات کو ایک نمایاں حیثیت سے پیش کیا جائے اور یہیں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ماحول اور معاشرہ میں رہ کر ان چیزوں پر عمل کرنا چاہیے جو دعوت اسلامی کے لئے زیادہ مناسب ہوں۔ باوجود اس کے کہ یہ بات مسلم ہے کہ داڑھی کا بڑھانا ہی اصل ہے۔

سوال: مرد اور عورت کا اسلامی لباس کیا ہے؟

جواب: اسلام میں مرد یا عورت کسی کے لباس کی تعیین نہیں کی گئی ہے اور یہی چیز دین کے حسن وجمال اور اس کی نرمی کی طرف غماز ہے۔ یہاں صرف دونوں کے لباس کی تحدید کر دی گئی ہے اور ان حدود کے اندر انہیں بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

عورت کا ایسا لباس پہننا حرام ہے جسے پہن کر بھی وہ عریاں نظر آئے یا اتنا چست لباس پہنے جس سے جسم کے خطوط نمایاں اور فتنہ کی جگہیں نظر آئیں یا ایسا لباس پہنیں جو نہایت مختصر ہو اور جسم کے دوسرے اعضاء کھلے ہوں یا یہ کہ مرد کے لباس سے تشبہ اختیار کرے جس کی تحریم آئی ہے۔

اور مرد کے نسبت یہ حکم ہے کہ اس کا ستر گھٹنے سے لے کر ناف تک ہے، اس لیے وہ ایسا لباس نہیں پہنے گا جس سے اس کا ستر کھل جائے یا جس سے خطوط نمایاں ہوں، شہرت کا لباس بھی نہ پہنے (یعنی ایسا لباس جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے) ایسا لباس بھی نہیں پہنے گا جو غیر مسلموں کا لباس ہے (جیسے راہبوں اور یہودیوں کا لباس ہوتا ہے) سونا اور ریشم بھی نہیں پہنے گا۔ (جس کی تحریم کا ذکر روایتوں میں آتا ہے) عورتوں سے مشابہ لباس نہیں پہنے گا اور نہ ایسا لباس پہنے گا جو زمین سے گھسٹ رہا ہو۔ ان کے علاوہ اسے اختیار ہے کہ جو چاہے وہ پہنے۔

سوال: کمپنیوں اور بنکوں سے حاصل ہونے والے فوائد کا کیا حکم ہے؟

جواب: یہ اصولی بات یاد رہے کہ ہر قرض میں جو نفع ملتا ہے وہ سود ہوتا ہے اسلام میں مال فی الواقع کوئی فائدہ نہیں دیتا، فائدہ دینے والی چیز اس کو کام میں استعمال کرنا ہے۔ اس لیے وہ اموال جو بنکوں اور کمپنیوں سے ملتے ہیں جن کے نفع میں تو آدمی شریک ہو لیکن نقصانات میں شریک نہ ہو تو وہ سود میں شامل ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی دولت کو تجارت میں لگانا چاہیے یا ایسی کمپنیوں میں لگائے جو منصفانہ شرائط کے ساتھ سے فائدہ حاصل کریں اور بنک وغیرہ میں اسے اس مقصد کے لئے جمع نہ کریں۔

سوال: معقول اور منقول میں ہم کس کو مقدم رکھیں؟

جواب: جب کوئی بات اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر ثابت ہو جائے تو اس کو لے لینا واجب اور ضروری ہے اس میں کسی چوں چرا کی گنجائش نہیں کیونکہ معقولات کی حیثیت شریعت کے مآخذ کے خادم اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والے کی ہے۔

البتہ وہ احکام جن کی شریعت میں صراحت نہ کی گئی ہو اور اس میں کوئی نص نہ ہو تو ایسے مواقع پر عقل سلیم کے فیصلوں کو بھی شریعتِ اسلامیہ میں بڑی اہمیت ہے اس سلسلہ میں ایک اصولی قاعدہ یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ نص میں کسی قسم کے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ احادیث میں جہاں کہیں بھی کسی قسم کا اُلجھاؤ یا ابہام ہو تو عقلِ سلیم کو اس کی تحقیق و تفتیش کرنی چاہیے تاکہ اس کا تعارض ختم ہو جائے، اور مسئلہ پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجائے۔

ب۔ سیاست سے متعلق سوالات:

سوال: اولی الامر کی اطاعت کس حد تک جائز ہے؟

جواب: اولی الامر کی اطاعت واجب ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کس رنگ اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس وقت تک اطاعت کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ اس کے احکام اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے متصادم نہ ہوں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب تک وہ اللہ کے حقوق کی حفاظت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

" مسلم شخص پر سننا اور اطاعت کرنا ہے چاہے اسے پسند ہو یا ناپسند یہاں تک کہ اسے کسی معصیت کا حکم دے دیا جائے، اس صورت میں کوئی سمع اور کوئی طاعت نہیں ہے۔

[بخاری: کتاب الاحکام]

سوال: بعض مسلمان ہجرت کے سلسلے میں سوچ رہے ہیں کہ وہ کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں سے وہ دعوت الی اللہ اور جہاد کا کام کر سکیں۔ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس طرح کی ہجرت ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہو سکتی اور نہ اس پر اتنے ثواب ہی کی توقع ہے کیونکہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے :

" فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے صرف جہاد ہے اور نیت ہے۔ صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ آدمی ایک تنگ مقام سے نسبتاً وسیع مقام کی طرف چلا جائے جہاں وہ زیادہ آزادی سے اپنا کام کر سکتا ہو۔ یہ واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر اجر بھی متوقع ہے۔ اب یہ داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں اسے اطمینان ہو کہ وہ سکون کے ساتھ دعوت کو فروغ دے سکتا ہے۔

سوال: متعدد فرقے کام کر رہے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے برحق ہونے کا اور دوسرے کے برسرِ باطل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے !! اس طرح کی صورت حال میں کیا کیا جائے؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ " حق کو اچھی طرح جان لو تو صاحب حق کو بھی پہچان لوگے " اسی طرح اگر آپ ارکان اسلام کو اچھی طرح جان لیں گے تو جو فرقہ بھی ان ارکان کی مخالفت کرتا ہو تو وہ خارج از اسلام ہے۔ پھر جب آپ ایک اسلامی معاشرہ کی خصوصیت اس کے آداب اس کی فطرت اور سلف صالحین سے لے کر اب تک کے احوال سے واقف ہو جائیں تو آپ ہر فرقے کو اسی پر قیاس کر لیجیے۔ اگر کوئی فرقہ یا جماعت ان اصولوں اور ارکان سے منحرف ہے تو اس سے بچنا اور ہوشیار رہنا آپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ سیدھے راستے کی پیروی کے لئے یہی صحیح طریقہ ہے۔ واضح رہے کہ علم ایک نور ہے اور ہر مسلمان پر اس کا حصول فرض ہے تاکہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں نہ بھٹکے۔ سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے :

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ [البقرہ: ۱۴۸/۲]

" ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو "

سوال: قومیت کا کیا مفہوم ہے اور دین سے اس کا کیا تعلق ہے؟

جواب: قومیت کا مفہوم اور اس کے حدود بہت سے لوگوں سے مخفی ہیں یہاں تک کہ بہت سے وہ لوگ بھی اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں جو چیخ چیخ کر اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

اگر قومیت سے مراد اس سرزمین کی محبت ہے جہاں کوئی قوم رہتی اور بستی ہو تو یہ ایک مستحسن چیز ہے وطن کی محبت ایمان کا ایک جزو ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی اپنے وطن خاص سے اس طرح محبت کرے جو اسے اس کے وطن عام سے غافل نہ کر دے۔ وطن عام سے مراد ہر وہ ملک ہے جہاں مسلم اکثریت کی بستی ہے اور اگر قومیت سے مراد قوم کی محبت اور ان کی اپنی نسبت کرنا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں جب تک کہ کسی دوسری قوم پر ظلم وزیادتی نہ ہو رہی ہو۔ نیز یہ کہ اس جذبہ کی وجہ سے کوئی قوم کسی کی دشمن نہ بن جائے اور اگر قومیت سے مراد زبان ہے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زبان آپس کے خیالات کے سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اپنے ہم زبان سے محبت کرنا ایک فطری بات ہے۔ لیکن اگر قومی فلسفہ کو اس لیے اپنایا جائے کہ اس سے اسلام اور عالم اسلام کو نقصان پہنچے اور مسلم قوم کو اس کے عظیم الشان مقصد سے ہٹا کر ایک محدود مقصد کی طرف لے آیا جائے۔ یا جذبہ قومیت کو مسلک کے مسائل یا مقدس مقامات کو یاد دلا کر بھڑکایا جائے یا اس قومیت کو فی نفسہٖ ایک مقصد بنا دیا جائے اور قومیت اور زبان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے جیسے سندھی کو پنجابی پر اور سرحدی کو بلوچی پر یا زبان کے اعتبار سے اردو سپیکنگ کو پنجابی یا پشتو بولنے والے پر، عربی کو عجمی پر اور رنگ کے اعتبار سے جیسے گورے کو کالے پر، اسی طرح برادری کے اعتبار سے آرائیں کو رانا پر یا جاٹ کو گجر پر، ایسے ہی دیگر شکلیں سمجھ لیں) تو یہ بات معلوم ہے کہ یہ سب کی اندھی تقلید اور بے بصیرتی ہے اور یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ جنگ عظیم اول اور ثانی اسی قومیت کی آگ کو بھڑکانے کی وجہ سے واقع ہوئیں جسے "امن پسندوں" نے بھڑکا دیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ کچھ مادی فوائد حاصل کر سکیں۔

سوال: ہم قرآن کریم کا فہم کیسے حاصل کریں؟

جواب: قلبِ انسانی ہی قرآنِ کریم کی بہترین مفسر ہے بشرطیکہ عربی زبان کے اصول و قواعد سے بھی آدمی آگاہ ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: " ہم نے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے"۔ دوسری جگہ فرماتا ہے: " کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں۔"

قرآن فہمی کا ایک بڑا ذریعہ قدیم مفسرین کی رایوں کا علم بھی ہے کیونکہ وہ لوگ عہدِ نبوت سے بہت قریب ہیں اور ناسخ و منسوخ، اسبابِ نزول اور بعض آیتوں کی تفہیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور تشریح سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اسرائیلی خرافات سے بچنا چاہیے۔ ہماری تفسیروں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان چیزوں کے لینے میں مفسرین نے حُسن نیت، صدق اجتہاد اور غلط تاویلوں سے احتراز سے کام لیا ہے ان تفسیروں کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سب کے سب آیاتِ الٰہی کی تفہیم کی ایک کوشش ہیں۔ صرف ایک کوشش۔

قرآن کو خود قرآن سے سمجھنا چاہیے کیونکہ مختلف آیتوں میں جو موافقت اور گہرا ربط ہے اس سے قرآن کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے بالکل اسی طرح فہمِ قرآن کے لیے حدیث سے بھی مدد لی جانی چاہیے کیونکہ احادیث قرآن کی تشریح ہیں۔ جبکہ عام لوگوں کے لئے اپنے زمانے کے ماہرینِ قرآن مشائخ سے سیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔

سوال: اسلام میں رواداری کی حدود کیا ہیں؟

جواب: بعض لوگ رواداری کا مفہوم مداہنت سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ہر صاحب رائے اور بدعتی جس چیز پر راضی ہو اس پر راضی ہو جایا جائے۔ حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے حق صرف ایک ہے ایک ہی مسئلہ میں اس کے کئی روپ نہیں ہو سکتے۔ اسلام میں نفاق اور منافقین سخت مبغوض ہیں۔ رواداری کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے نظریہ کو باطل سمجھتے ہوئے ہم اسے قبول کر لیں اور اس پر تنقید اس لیے نہ کریں کہ انہیں تکلیف ہو گی، اس لیے ناروا نہ کہیں کہ ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ جائیں گی اور ان کے

احساسات مجروح ہوں گے۔ ان سب معاملات میں ہم کیا رویہ اختیار کریں؟ اس کی طرف قرآن کریم یوں توجہ دلاتا ہے:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۔[الفرقا: ۷۲/۲۵]

" اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف لوگوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔"

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ۔[الرعد: ۲۲/۱۳]

" اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔"

فَلِذَالِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلاَ تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ۔ [الشوریٰ: ۱۵/۴۲]

"اس لیے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی، ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں۔"

سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ لاَ نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ ۔ [القصص: ۵۵/۲۸]

" تم کو سلام ہے ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

ان ظالموں، گمراہوں اور بد کرداروں کے ساتھ رواداری برتنا بزدلی اور نکما پن ہے بشرطیکہ ہمیں ان کے اوپر قدرت بھی حاصل ہو۔

سوال: اسلامی حکومت میں عورتوں کی سرگرمیوں کے حدود بیان کیجیے؟

جواب: عورتوں کی سرگرمیاں مردوں کے مقابلہ میں کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں، عورت کے کام کے لئے ایک وسیع میدان ہے جس کی نہایت اہمیت ہے اس کا دائرہ کار گھر کی چہار دیواری ہے... گھر جو اولاد کی پہلی تربیت گاہ، پہلا میدان عمل اور زندگی کی حرارت کا پہلا سرچشمہ ہوتا ہے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اسلام ضرورت کے وقت عورت کو خرید وفروخت سے

بھی منع نہیں کرتا، علم کے حصول کی بھی آزادی دیتا ہے بشرطیکہ اس میں مردوں کے ساتھ اختلاط اور بے پردگی نہ ہو، جہاد میں اس کو حصہ لینے کی اجازت دیتا ہے (بشرطیکہ مرد کے ساتھ خلوت واختلاط نہ ہو) اور اس میدان میں اس کے ذمہ وہی خدمت سپرد کرتا ہے جو اس کی فطرت کے ہم آہنگ ہے مثلا: زخمیوں کی مرہم پٹی، انہیں پانی پلانا، کھانا تیار کرنا، البتہ انہیں فوجیوں کے تعیش کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔

ان کو ملکی سیاست میں داخل کرنا یہ کئی وجوہ سے مناسب نہیں ہے کیونکہ فطرتاً یہ جلد باز ہوتی ہیں اور رازوں کی حفاظت نہیں کر پاتیں۔ (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورت کو حاکم بنانے سے منع فرمادیا ہے۔ فرمایا:

لَنْ يُّفْلِحَ الْقَوْمُ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً۔ [بخاری: کتاب الفتن]

"وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کردیئے۔"

(یعنی اس کو اپنا والی اور حاکم بنادیا) اس طرح حکومت کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کو نہیں لیا جائے گا کیونکہ یہ بہت جذباتی ہوتی ہیں اور آسانی سے دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ جن ملکوں نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں ان کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ رہے وہ لوگ جو عورتوں کی آزادی کا نام نہاد نعرہ بلند کرتے ہیں ان کے خطرناک ارادے اب ڈھکے چھپے نہیں رہ گئے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ عورت کو اس کے گھر سے کھینچ کر سڑک پر لا کھڑا کیا جائے اور انہیں اس تجربہ میں سخت ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

سچ کہا ہے حکیم وخبیر مولا کریم نے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ [النساء: ۲۶،۲۸/۶]

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہیں طریقوں پر تمہیں چلائے، جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے، وہ اپنی رحمت کے ساتھ

تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی، ہاں ! اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ، اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

دعوت کے کام سے متعلق چند سوالات:

سوال: دعوت کو پیش کرنے میں ہم نرمی سے کام لیں یا اسے کھول کھول کر بیان کر دیں؟

جواب: یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب "ہاں" یا "نہیں" میں نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ایک اصولی بات یاد رکھنی چاہیے کہ حق بات کہنے میں کسی ملامت گیر کی ملامت کی قطعاً پرواہ نہ کرنا چاہیے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد کے خلفاء کے دور میں بھی مصالح دعوت کے پیش نظر لوگوں کے ساتھ نرمی ورواداری کا رویہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ چند مراحل میں انہیں دعوت حق سے اچھی طرح واقف کرا دیا جائے۔ پھر وہ لطف وعنایت اور رحمت ومحبت کے بھی زیادہ مستحق ہوتے ہیں جس سے ان کے دلوں کی سختی ختم ہوتی ہے اور پہلے سے جمی ہوئی غلط فہمی دور ہوتی ہے۔ بہر حال داعی کو دعوت پیش کرتے ہوئے مصلحت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور جو داعی اپنی بات کو دو ٹوک اور واضح لفظوں میں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے اس کی بھی باتوں میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ایک خلق کثیر ہدایت حاصل کرتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا تعلق امراء اور حکام سے ہو۔ اور جو داعی اپنی دعوت کے پیش کرنے میں احتیاط، بردباری اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتا ہے تو یہ چیز بھی بڑی فائدہ مند ہوتی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں اور اس سے بڑا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس طرز کی دعوت مزدور طبقہ، طلبہ اور عام عورتوں میں اپنا خاص اثر دکھاتی ہے۔ اس لیے دعوت پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے حالات کو سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ کارِ دعوت ایک مسلمان کے لئے فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے، خواہ اثرات جلد برآمد ہوں یا کچھ دیر لگے۔

سوال: دعوت کا کام ٹھیک طرح سے انجام دینے کے لئے فلاحی ادارے یا رفاہی مراکز کو قائم کرنا ہے؟ کیا یہ مناسب ہے کہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف تحریک کی ترقی پر اپنی صلاحتیں صرف کی جائیں؟

جواب: رفاہی اداروں کے قیام کی اصل غرض وغایت کچھ نیکی اور خدمت کا کام کرنا ہوتا ہے اور اسی کے لئے مال اکٹھا کیا جاتا ہے اور ادارے قائم کئے جاتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ کام کرنے میں سہولت ہو اور انسانی خدمت کا مقصد بہتر طور سے پورا ہوسکے۔

اور دعوت و تبلیغ کے لئے جماعتیں قائم کی جاتی ہیں ان کا مقصد عمل پیہم ہوتا ہے انہیں اکثر حالتوں میں ظلم وستم کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اس لیے مال جمع کرنا اور جاگیر بنانا اس کام سے میل نہیں کھاتا۔ بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ اس دولت کو تحریک اور داعی کے مفاد پر خرچ کر دیا جائے۔

سوال: دعوت کے کام کا آغاز ہم اخلاق کو سدھارنے سے کریں یا موقع کے لحاظ سے اس کا آغاز کریں؟

جواب: ہر وہ شخص جو عملی طور سے کارِ دعوت میں حصہ لینا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک لائحہ عمل متعین کرے اور اس کے مطابق اپنی دعوت کا آغاز کرے؟

داعی ایک عظیم مقصد کا علمبردار ہوتا ہے، اس کے حصول کے لئے کچھ وسائل وذرائع رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی مکلّف ہے کہ جب اسے موقع ملے معروف کا حکم دے اور اگر کوئی منکر دیکھے تو اس سے روک بھی دے۔ اب اگر وہ کسی کو معروف کا حکم دے رہا ہے یا منکر سے روک رہا ہے تو کسی کو یہ کہنے کا ہرگز حق نہیں ہے کہ بھئی ابھی تو انتظار کرو تاکہ عوام کے اخلاق درست ہو جائیں۔"

اس کا یہ کہنا مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط ہے:

الف۔ عوام کے اخلاق کی اصلاح ایک ایسا کام ہے جس کی تکمیل میں عمریں اور صدیاں بیت جاتی ہیں اور اس کا انجام پھر بھی معلوم نہیں ہو پاتا۔

ب۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے اس وقت تک رُکا رہنا جب تک کہ عوام کے اخلاق درست نہ ہو جائیں شریعت کی نگاہ میں غلط ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے جو کوئی (برائی اور گناہ کا کام) دیکھے تو چاہیے کہ اسے بدل دے۔" [مسلم: کتاب الایمان]

ج: کسی منکر پر اظہار نکیر کرنا (روکنا، منع کرنا) ہر داعی کے فرائض میں داخل ہے۔ اگرچہ اس کو نافذ کرنے میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ یہ داعی کا خاص کام ہے جس کی طرف اشارہ اس آیت میں ملتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔[آل عمران: ۱۰۴/۳]

" تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

اس کے باوجود جو لوگ اخلاقیات کو پہلے درست کرنے کی رائے رکھتے ہیں وہ دراصل اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

سوال: ہمارے اہل وعیال خود ہم سے متاثر ہونے کے بجائے معاشرہ کے اثرات نسبتاً زیادہ قبول کرتے ہیں، اس صورت حال میں ہم کیا کریں؟

جواب: سچ ہے کہ ہمارے لڑکے جس ماحول میں زندگی گذارتے ہیں اس کے اثرات ان کے اوپر بہت گہرے مرتب ہوتے ہیں مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے تین لڑکے ہیں ان میں ایک ازہر میں دوسرا کسی غیر اسلامی سکول میں اور تیسرا کسی اور کالج میں زیرِ تعلیم ہو تو ان تینوں کے اخلاق وعادات میں اتنا ہی فرق ہوگا جتنا کہ ان کالجوں اور مدرسوں میں ہے۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان کے سرپرست ان سے پابندی سے ملتے، ان سے گفتگو کریں، ان کی غلطیوں کی اصلاح کریں اور ان کے درمیان قربت پیدا کرنے کی کوشش کریں تو یہ فرق بڑی حد تک کم ہو سکتا ہے بلکہ

یہ بھی ممکن ہے کہ یکسر ختم ہو جائے۔

گھر کا مالک دراصل (قوام) نگراں ہوتا ہے اور اس کے اثرات گھر والوں پر بہت گہرے پڑتے ہیں۔ بشرطیکہ خاندانی تعلقات مضبوط ہوں۔ لیکن اگر خود گھر میں انتشار پیدا ہو جائے تو لڑکوں کا خارجی ماحول سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ اگر اس طرح کی صورت حال پیدا ہو جائے تو درج ذیل طریقوں سے اسے دفع کیا جاسکتا ہے:

۱: لڑکوں کو ابھارا جائے کہ وہ اچھے دوست بنائیں اور انہیں خود اپنی حالت درست کرنے کی طرف برابر توجہ دلائی جائے۔

۲: انہیں نرمی سے سمجھایا جائے۔ انہیں سخت سست اور توہین آمیز کلمات ہر گز نہ کہے جائیں۔

۳: اگر ممکن ہو تو مسئلہ کا بنیادی حل تلاش کیا جائے اور سب سے آخر میں یہ کہ اللہ سے ان کے سدھار کی دعا مانگی جائے۔

مغربی افکار سے متعلق مسائل:

۱: دین داری اخلاقِ فاضلہ کا نام ہے نہ کہ رسم ورواج کا، دین کا رسم ورواج کے اندر محدود کرنا کام چوروں، لذت پرستوں کا تصور ہے جو کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے فرض کردہ احکام کی پیروی نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی اسی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے وہ تمام فرائض (روزہ، حج اور زکوٰۃ) کو باطل اور لغو کہتے ہیں۔ یقیناً اس طرح کا خیال نہایت گمراہ کن اور صریح کفر ہے۔

اسلام، ایمان و عمل کا نام ہے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوالصَّالِحَاتِ" یعنی یہ کہ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی صحت پر کامل اعتقاد اور ان کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے کا نام اسلام ہے، ان اعتقادات کو کسی خود ساختہ نظریہ کے مطابق جس کا علم و عمل سے کوئی تعلق نہیں، بدلا نہیں جاسکتا" رسم ورواج" کی اصطلاح بھی عجیب ہے۔ ہم کسی مبہم اور پیچیدہ رسم کی پیروی ہر گز نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف ہماری جو بھی عبادت ہے وہ قابل فہم ہے اور ہر عقل سلیم اس کو معقول تسلیم کرے گی۔

۲: اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت دی گئی تھی پھر وہ ختم ہو گئی۔ ہر گز نہیں اسلام میں "دفاعی جنگ" نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ جہاد کی اصل غرض وغایت اللہ کے کلمے کو ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو اس کو قبول نہیں کرتے اور عوام کے ذہن وفکر پر زبردستی مسلط ہیں۔ ہمارا یہ جہاد ملک گیری کی ہوس اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لئے نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاد سے پہلے کفار کو تین طرح کے اختیارات دیئے جاتے ہیں:

(۱) اسلام کو قبول کرو (۲) جزیہ دو (۳) یا پھر جنگ کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

قرآن کریم کی اس آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ [البقرہ: ۲/۱۹۳]

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔"

ایک مسلمان سپاہی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے فوج میں شامل ہوتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص سے برسرپیکار ہو جو الہامی شریعت کا انکار کرتا ہو تاکہ وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ یہ فریضہ مسلمانوں کے اوپر قیامت تک کے لئے ہے، کسی ظالم کا ظلم اور کسی سخت گیر کی سختی اسے ہر گز ختم نہیں کر سکتی۔ آپ خود سوچیں کہ اگر باطل اسلام کے خلاف برسرپیکار ہو، اس کی زمینوں کو ہڑپ کر لے اور اس کے مقدس مقامات کو پامال کرے تو آپ کی کیا حالت ہو گی؟

پھر اسلام کو آئے ہوئے صدیاں بیت گئیں اور آج تک کسی مسلمان نے یہ نہیں کہا کہ اسلام سے جہاد کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد مسلمان بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس خبیث پودے کی آبیاری کچھ "غلاموں" نے اپنے استعمار پسند آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے کی ہے، حالانکہ قرآن مجید کی سیکڑوں آیتیں اور بے شمار احادیث نبویہ اس کی تردید کرتی ہیں۔

ظاہر و باطن:

صوفیہ اور باطنیہ کا ایک گروہ اس گمان میں مبتلا ہے کہ دین اسلام کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا "ظاہری" پہلو ہے جس کی اہمیت کم ہے۔ یہ ظاہری پہلو شرعی فرائض وواجبات، فقہ

کے احکام اور عام اسلامی اصول وضوابط پر مشتمل ہے۔ دین اسلام کا دوسرا پہلو" باطنی" ہے اور اصل اہمیت اسی کی ہے یہ پہلو پُر اسرار اور مخفی ہے جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کا علم عطیہ الٰہی پر موقوف ہے اور یہ عطیہ یا تو کسی متعین نسب سے یا معروف حلقوں سے مربوط ہے۔ اس خیال اور گمان نے حق و باطل کو تولنے اور جانچنے کی میزان کے بارے میں اکثر مسلمانوں کے اندر ایک اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح سے ان کو ایک بڑی گمراہی تک پہنچا دیا ہے، ان کے بعض قائدین نے نبوت اور الوہیت کا دعویٰ تک کر ڈالا ہے یعنی یہ کہ اللہ کی وحی ان پر اترتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ ان متصوفہ اور باطنیہ کے متبعین واجبات دینیہ بلکہ واجبات اخلاقیہ سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔ ان کی دلیل وہ خواب ہیں جو ان کے قائدین دیکھتے ہیں یا انہیں دکھائے جاتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ مقربین بارگاہ میں سے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ان کے اور ان جیسے دوسروں کے بارے میں یہ ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا۔ [النساء: ۴/۵۰،۴۹]

" تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور (انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرا برابر ظلم نہیں کیا جاتا دیکھو تو سہی اللہ پر بھی جھوٹے افتراء گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریح گناہ گار ہونے کے لئے یہی ایک گناہ کافی ہے۔"

سچی بات یہ ہے کہ اسلام کا ایک ہی پہلو ہے اور یہ کہ اللہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت رسالت کو تمام لوگوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا اور اس میں سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ اس کے اور کسی انسان کے درمیان نسلی تعلق نہیں ہے اور اس کی رضا صرف اس کی اطاعت سے حاصل کی جاسکتی ہے، اور اس کی اطاعت اس شریعت پر عمل کرکے کی جاسکتی ہے جو اس نے نازل کی ہے۔

وسیلہ اور شفاعت:

ایک دوسرا فریق یہ گمان رکھتا ہے کہ ان کے لئے خوف کی کوئی بات نہیں ہے اس لیے کہ ان کو نبی یا ولی کی شفاعت حاصل ہو گی اور انہیں اس عقیدہ کی وجہ سے حق حاصل ہے کہ جو چاہیں کریں۔ ان کے اس عقیدہ اور منطق کا فساد اور اس کی خرابی بالکل واضح ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ۔ [البقرہ: ۲/ ۲۷ا تا ۱۳۰]

" کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی وَھُمۡ مِّنۡ خَشۡیَتِہٖ مُشۡفِقُوۡنَ۔ [الانبیاء: ۲۸/۴]

" وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں"۔

اور یہ بھی ہے:

وَمَنۡ یَّقُلۡ مِنۡھُمۡ اِنِّیۡۤ اِلٰہٌ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَذٰلِکَ نَجۡزِیۡہِ جَھَنَّمَ۔ [الانبیاء: ۲۹/۴]

"اور جو ان سے کوئی یہ کہے کہ اللہ کے سوا میں بھی الٰہ ہوں تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے۔"

لہٰذا کوئی بھی کسی کے لئے اللہ کی اجازت کے بغیر سفارش کی جرأت نہ کر سکے گا، شفاعت کے کچھ آداب و شروط ہیں انہیں نظر انداز کر کے اس پر اعتماد کرنا ایک بڑے وہم پر تکیہ کرنا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی پڑھتے ہیں:

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ [الزلزال: ۹/۹۹]

" پھر جس نے ذرا برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرا برابر (برائی گناہ) بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

وسیلہ اور شفاعت کی تفسیر میں توسع (یعنی بے دلیل وسعت پیدا کرنا) عدل، جوابدہی، اور جزا و سزا کے ان تمام پیمانوں کو منہدم کر دیتا ہے جن سے اسلام میں امتیاز ہوتا ہے۔

وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَرَسُوۡلُہٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ۔ [التوبہ: ۱۰۵/۹]

" اور اے نبی! تم ان لوگوں سے کہدو کہ تم عمل کرو اور اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنین سب دیکھیں گے کہ اب تمہارا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔"

قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو ہم نہیں مانتے" یہ اعتقاد تمام برائیوں کا سرچشمہ اور صریح جہالت ہے۔ برائیوں کا سرچشمہ اس لیے ہے کہ اس سے کلمہ شہادت کا دوسرا جز جس میں نبی کی رسالت کا اقرار کیا گیا ہے اس کا انکار لازم آتا ہے۔ یہ اعتقاد، سنت مطہرہ کا خاتمہ کر دیتا ہے جو قرآن کریم کی تفسیر اور تفصیل ہے:

وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔[الحشر: ۵۹/۷]

" جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔"

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔[النجم: ۵۳/۳]

"اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا"

البتہ بعض شر پسندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بعض غلط باتیں منسوب کی ہیں اور بعض جاہلوں نے خواہ مخواہ کی حدیثیں گھڑ لی ہیں تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ انتظام فرمایا ہے کہ اس نے علم حدیث کے کچھ ایسے ماہرین تیار کئے جنہوں نے صحیح اور غلط روایتوں کی تحقیق کی ہے۔ اور آج ہر مسلمان صحیح اور غلط روایات میں تمیز کر سکتا ہے۔ پھر حدیث نبوی کی خدمت اس طرح تو ممکن نہیں کہ اس سے لوگوں کو دور رکھیں بلکہ اس کی خدمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تحقیق کرکے غلط روایتوں کی تردید کریں۔ اگر فی الواقع حدیث رسول سے محبت ہے۔

معاشی بدحالی انسانی مسائل کی واحد وجہ ہے؟

نہیں .....یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہے۔ ان دونوں کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ انسانی جسم فانی ہے اور روح جسم کی محافظ ہے، اس کی زندگی کا انحصار اسی پر ہے۔ روح ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ چاہے انسان مٹی میں مل جائے۔ جیسے جسم انسانی کی ضرورت غذا ہے ویسے ہی روح انسانی کی ضرورت ایمان ہے اور اسی ایمان کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے جسم بنایا گیا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری طور سے جسم انسانی نہایت خوش اور مطمئن ہوتا ہے حالانکہ روح کی شقاوت جسم کی شقاوت ہے اور یہی شقاوت اس کو بیمار کرتی ہے حتی کہ وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

زندگی مجرد مادہ کا نام نہیں ورنہ پھر انسان اور حیوان کے درمیان تمیز کیسے کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ حیوان بھی اپنی اولاد سے روحانی محبت کرتا ہے اور بعض حیوانوں کی محبت کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی موت پر کھانا پینا چھوڑ دیتے اور اپنے رفیق کے غم میں گھل گھل کر جان بھی دے دیتے ہیں۔ یہ بدل مادیت کا فلسفہ اس لیے ایجاد کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ کسی معبود کے تصور کا انکار کیا جاسکے جو انسانی قدروں کی بنیاد ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ان جرائم کا ارتکاب کر سکیں جن کی بدولت وہ خدائی کا سکہ جما سکیں۔

یہ اور اس قسم کے دسیوں سوالات ہیں جو عام وخاص ہر شخص کے ذہن میں مختلف مواقع پر ابھرتے ہیں۔

ان کا جواب آسان نہیں ہے اور ان سوالوں کا صرف ایک جواب بھی نہیں ہو سکتا بلکہ حالات اور زمانہ کے اختلاف کے ساتھ ساتھ اس کے جوابات بھی بدل سکتے ہیں۔

ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ جو سوالات اس کے ذہن میں کھٹکیں وہ اسے اہل علم سے دریافت کرے اور سب سے پہلے خود بڑھ کر غور کرے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ معلم خود متعلّم سے سیکھے کیونکہ زندگی تو لینے اور دینے ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ [الانبیاء:۲۱/۷]

"اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھا کرو"۔

اجتماعات کا قیام:

ایک داعی کے لئے عوام کو اکھٹا کرنے، دعوت کو بہتر انداز میں پیش کرنے اجتماعات کا نظم سنبھالنے کے فن سے بھی واقف ہونا ضروری ہے، یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں بہت سی چیزوں کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے، بعض اجتماعات ملکی پیمانے پر ہوتے ہیں کچھ ضلعی اور مقامی پیمانے پر بھی ہوتے ہیں۔

اس جلدی میں ہم صرف چند موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن کا تعلق اجتماعات کے انعقاد سے ہے:

الف۔ دعوت کی قسمیں:

دعوت کبھی خاص نوعیت کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ اس میں شریک ہونے والوں کی تعداد متعین اور محدود ہوتی ہے اور کوئی عوامی نوعیت کی ہوتی ہے جس میں ہر شخص شرکت کر سکتا ہے۔

خصوصی دعوت:

اس نوع کی دعوت عموماً کچھ خاص لوگوں کے لئے ہوتی ہے جن کا انتخاب کسی مصلحت کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں صرف ہم خیال اور ہم فکر لوگوں (ارکان ومعاونین) کو دعوت دی جاتی ہے، تاکہ دعوت کامیابی سے ہمکنار ہوسکے اور حتی الوسع اختلاف رائے سے بچا جاسکے۔ اس طرح کے اجتماعات میں اکثر تبادلہ خیالات اور مشورے ہوتے ہیں۔

عوامی دعوت:

اس کا مقصد بڑی تعداد میں لوگوں کو اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور عوام کو مدعو کرنے کے لئے اس میں مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ اس کا پورا انتظام وانصرام مدعو کرنے والوں کے ذمہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر عوام کو اس کی ذمہ داری سونپ دی جائے تو اس کے نتائج اچھے برآمد نہیں ہو سکتے۔

ب۔ دعوت کا اعلان:

اس کا اعلان کرنے کے لئے مختلف وسائل وذرائع استعمال کئے جاتے ہیں کبھی اخبارات، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ اس کو نشر کیا جاتا ہے اور کبھی مسجدوں اور مجمع کثیر میں نیز گاڑیوں پر لاؤڈ اسپیکر رکھ کر اعلان کیا جاتا ہے۔ (نیز اشتہارات، پلے کارڈ، بینرز اور سائن بورڈز بھی اس مقصد کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں)۔

خصوصی دعوت نامے:

بہتر یہ ہے کہ یہ کارڈ صاف ستھرا اور موٹے کاغذ کا ہو جس پر مدعو کا نام اور اس کا پورا پتہ، دعوت کی جگہ اور تاریخ، سبب اور موضوع، بھیجنے کی تاریخ اور داعی کا نام اور پتہ مندرج

ہو۔ پھر آخر میں کوئی اور نوٹ ہو مثلاً یہ کہ بچے ساتھ میں ہوں یا نہیں، خواتین آسکتی ہیں یا نہیں، اجتماع کتنے دن تک رہے گا وغیرہ۔

کارڈ کی تقسیم:

کارڈ عام طور پر اس طرح بھیجے جاتے ہیں کہ یہ اجتماع کی تاریخ سے کم از کم ایک ہفتہ قبل پہنچ جائیں اور کبھی خصوصی حالات کی بنا پر ہاتھ سے بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

داعی جن شخصیات کی شرکت کا زیادہ خواہشمند ہو ان سے براہ راست ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرے۔ ذمہ دار اجتماع کو کارڈ کی تقسیم کے معاملے میں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کسی کا کارڈ گم ہو جائے یا کہیں سے کوئی شکایت نامہ موصول ہو تو ان سب کا جواب دینے کے لئے ہمیشہ مستعد رہے۔

اجتماع گاہ:

اجتماع گاہ کا انتخاب شہر یا بستی کے بیچ میں ہونا چاہیے، انتخاب میں جگہ کی صفائی وستھرائی اور اس کی وسعت وکشادگی نیز کھلی فضا کا خاص خیال رکھنا چاہیے جہاں تک پہنچنا آسان ہو۔ شور وغل، ہنگاموں نیز دھواں وغیرہ سے وہ جگہ بالکل پاک ہو، نیز یہ کہ کسی بھی پارٹی کے اثرات سے خالی ہو، کیونکہ بسا اوقات اس طرح کی صورت حال میں بہت سے لوگ وہاں جانا پسند نہیں کرتے۔ جگہ کی دریتگی کا خاص خیال رکھنا چاہیے تاکہ دوران اجتماع داخل ہونے میں آسانی ہو۔

کارکنان اجتماع:

اجتماع کے انتظام کو سنبھالنے کے لئے ایک کمیٹی ہونی چاہیے اور اس کا ایک امیر ہونا چاہیے جس کو ناظم اجتماع کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی پروگرام تیار کرے گی، مقررین کی فہرست اور ہر ایک کے لئے موضوع اور وقت متعین کرے گی۔ تقریروں کے بعد سوالات وجوابات کی بھی نشست ہونی چاہیے۔

کچھ لوگوں کو پانی وغیرہ کا انتظام کرنے اور دوسری خدمتوں کو انجام دینے کے لئے مامور کیا جانا چاہیے۔ خدمتوں کے ضمن میں درج ذیل چیزیں بھی آتی ہیں:

جلسہ گاہ کی نگرانی داخلی اور خارجی طور سے :

آواز کی نگرانی کہ ٹھیک سے سامعین تک پہنچ رہی ہے یا نہیں۔ بجلی کے کنکشن کی دیکھ بھال، بچوں کو اجتماع گاہ سے دور رکھا جائے، دوسری اور تکلیف دہ چیزوں کا انسداد کریں۔

اجتماع کے بعد :

ظاہر ہے کہ اجتماع کروانا نہایت پتہ ماری کا کام ہے اور بڑی مشکلوں کے بعد اس کا انتظام ہو پاتا ہے، اس لیے اس سے استفادہ کرنے میں کافی حریص ہونا چاہیے۔ کیونکہ اصل مقصد مجمع اکٹھا کر لینا نہیں ہے بلکہ یہ اجتماع ایک دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اجتماع سے استفادہ کے لئے ہم درج ذیل باتوں کی نصیحت کرتے ہیں:

* وہ مشہور اور باعزت شخصیتیں جو اجتماع میں تشریف لائیں ان کا احترام کیجیے شکریہ ادا کیجیے ان سے کماحقہ استفادہ کیجیے اور ان کو احترام کے ساتھ رخصت کیجیے۔
* شرکاء جن سے کسی بہتری کی امید ہو اجتماع ختم ہونے کے بعد دوسرے دنوں میں بھی ان سے روابط رکھے جائیں تاکہ دوبارہ ان سے تعارف کرایا جاسکے اور ان کے خیالات معلوم کئے جاسکیں۔ انہیں کچھ کتابیں اور رسالے بھی ہدیہ کیجیے۔
* وہ تمام افراد جنہوں نے اجتماع کو کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے مثلاً مزدور تاجر حضرات اور آس پاس کے لوگ یا اپنے کارکن ان سے دوبارہ ملاقات کی جائے اور ان کا شکریہ ادا کیا جائے، کیونکہ احسان کی قدر کرنے سے دوبارہ بھی احسان کی توقع ہو سکتی ہے۔
* ساتھیوں، دوستوں، مقررین اور تمام شرکاء کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور ان سے فنڈ دینے کی اپیل کی جائے تاکہ دوبارہ پھر ملنے کے مواقع میسر آسکیں۔

یہ بات ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ آج کے اجتماع کی کامیابی اور ناکامی کا اثر کل کے اجتماع پر بھی پڑے گا۔

دعوتی ادارے :

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دعوت اسلامی کو فروغ دینے کے لئے جگہ جگہ مختلف شہروں میں تربیتی اداروں کا قیام عمل میں آرہا ہے یقیناً یہ ادارے نہایت

عظیم الشان خدمات انجام دے رہے اور نئی نسل کو دعوت کے لئے تیار کرنے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ ادارے مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھیں تو دعوت کا کام اور بہتر طریقہ سے انجام پا سکتا ہے:

۱: یہ ادارے آپس میں تعاون کریں بلکہ نسبتاً زیادہ تجربہ کار ادارے کو اپنی رہنمائی کے لئے منتخب کر لیں۔

۲: جدید وسائل وذرائع سے استفادہ کریں بلکہ نسبتاً زیادہ تجربہ کار ادارے کو اپنی رہنمائی کے لئے منتخب کر لیں۔

۳: اس میں ایسے مدرسین کام نہ کریں جنہوں نے صرف لمبی لمبی ڈگریاں حاصل کی ہوں یا کسی مخصوص مسلک کے متعصب پیرو ہوں بلکہ ان کا انتخاب تقویٰ اور کارکردگی کی بنیاد پر ہو۔

انہیں اس کام کے کرنے کی مہارت بھی ہو اور اس سے والہانہ شیفتگی بھی ہو اور اس کے نشیب وفراز سے بھی واقف ہوں تاکہ وہ اپنے طلبہ کے اندر وہی خصوصیات پیدا کر سکیں جو صدر اول سے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھیں۔ کبھی کبھی ان اداروں کے طلبہ کا اجتماعی تفریحی پروگرام بھی رکھنا چاہیے تاکہ انہیں اس ملک کے طول وعرض کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اور دعوت کے کام کرنے کی تربیت بھی ہو سکے اس سے ان کی فکر میں بلندی اور شعور میں وسعت پیدا ہو گی۔

فراغت کے بعد حکومت ان کی مالی امداد بھی کرے جیسا کہ ممالک عربیہ کے بعض حصوں میں آج کل ہو رہا ہے۔ اس طرح ایک مسجد کے امام اور ایک گاؤں میں رہنے والے کا مرتبہ یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے کے برابر ہو سکے گا اور احساس کمتری کا جذبہ بھی ختم ہو جائے گا۔ دعوت و تبلیغ کے کاموں میں آکر ان امور کا لحاظ کیا جائے تو اس سے ان کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ سکتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں میں چھپی ہوئی حق کی روشنی پھر سے نمایاں ہو سکتی ہے۔

مشکلات:

اس وقت دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کو داخلی اور خارجی دونوں طرح کی مشکلات درپیش ہیں، داخلی مشکلات سے ہماری مراد وہ مشکلات ہیں جو آج کل خود اسلامی معاشرہ میں

موجود ہیں اور جو مسلمانوں کے اندر ایک طویل مدت سے جاری رہنے والے اختلافات پسماندگی اور استعماریت کے غلبہ سے پیدا ہوئی ہیں، بعض کا تذکرہ ہم ذیل میں کرتے ہیں:

* راسخ العقیدہ مسلمانوں کا مختلف فرقوں میں منقسم ہو جانا، ایک دوسرے سے تعصب برتنا اور گروہ بندی کرنا ان تمام چیزوں نے مل کر اہل حق کو۔۔۔ عام پارٹیوں کی طرح ایک پارٹی بنا دیا ہے۔
* ایک مسلک پر چلنے والوں کا دوسرے مسلک اور ان کے ائمہ سے تعصب برتنا خواہ اختلاف کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

اپنے شیوخ، سرداروں اور مذہبی رہنماؤں کی ہر بات مان لینا خواہ ان کی آراء کتاب وسنت سے مختلف کیوں نہ ہوں، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں جس کو اختیار کر لینے کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے کتاب اللہ اور میری سنت۔" [مستدرک حاکم]

بعض مشکلات داعی پر اس وجہ سے آتی ہیں کہ وہ بزرگوں پر شوق تبلیغ پورا کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے کچھ اصول وقواعد ہیں جنہیں ان کو یاد رکھنا چاہیے اور ان کا خصوصی طور پر لحاظ کرنا چاہیے۔

* بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ جانے کے بعد کچھ سیکھنے سکھانے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ چیز ان کی نظر میں بچپن کی خصوصیات میں سے ہے۔اسی لئے وہ کچھ سیکھنے سکھانے اور بحث میں حصہ لینے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں لوگ انہیں جاہل نہ سمجھنے لگیں۔اسی طرح بعض عورتیں اپنی سہیلیوں کے یہاں اس وجہ سے جاتی ہیں تاکہ وہ وہاں جا کر اپنا غم بھلا سکیں یا اپنے زیورات کی نمائش کر سکیں ان کا مقصد علم حاصل کرنا دعوت دینا نہیں ہوتا۔

بہت سے داعیان دین براہ راست وعظ ونصیحت کے جام پلانے اور باہم تعاون سے تعلیم وتربیت کا کام انجام دینے کے درمیان فرق نہیں کر پاتے حالانکہ پہلا طریقہ نقائص اور خامیوں سے خالی نہیں ہے جبکہ دوسرا طریقہ اکثر ماہرین تربیت کے

نزدیک افضل اور مناسب ہے۔

پسماندگی کی بعض مثالیں:

بہت سے شہروں میں جہالت عام ہے لوگوں کے اندر اچھے برے، نفع ونقصان کی تمیز کا احساس ناپید ہے اور بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے نفع ونقصان پر کھل کر بحث کر سکیں۔ لوگ یہ روش یا تو کسی پیر صاحب کے احترام میں یا سلطان وقت کے خوف سے اختیار کرتے ہیں اور کبھی کبھی صحت، صفائی اور معاشرتی زندگی کے اصولوں سے ناواقفیت پسماندگی کا سبب بنتی ہے۔

ایک بہت برا سبب معاشرے میں پھیلی ہوئی غربت ہے جب داعی معاشرے کے غرباء کو دیکھتا ہے کہ انہیں وعظ ونصیحت سے زیادہ روٹی کی ضرورت ہے تو اسے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ (حالانکہ یہاں اسے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غربت پر مبنی حالات وواقعات کو سامنے رکھتے ہوئے بہترین حکمت عملی سے دعوت کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔)

استعماریت کے نشانات:

اس کے واضح اثرات یہ ہیں:

پارٹی بندی:

* افراد ملت کے آپس میں اختلافات اور حکومت اقتدار کے مظالم نیز عسکری طاقت کا خاتمہ۔
* دین اور اہل دین کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھنا اور دینی فکر کو مادی پیمانے سے ناپنا، نیز سیاست کو دین سے جدا کر دینا۔
* ہر باہر سے آئی ہوئی چیز خواہ وہ فکر ہو یا کوئی تجارت ہو یا افراد ہوں ان کو بڑا سمجھنا اور ان سے مرعوب ہو جانا۔
* عسکری قوت کا ضعف اور کلمتہ اللہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد سے فرار، تاریخ کو مغالطوں سے بھرنا، نیز ہماری فکری میراث پر حملہ۔
* اقتصادی بدحالی، جو اس وقت رونما ہوئی جب اہل ملک کی امتیازی خصوصیات کو ختم کر دیا گیا اور ان کے پر کاٹ دیئے گئے اور دشمن ان کے اوپر مسلط ہو گئے تو ہمارے

معاشرے میں یہ دردناک صورت حال پیدا ہوئی نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ صلحائے امت اور داعیان دین نے اپنے دعوتی فریضہ کو حد درجہ پیچیدہ اور مشکل سمجھنا شروع کر دیا۔

خارجی مشکلات:

خارجی مشکلات بھی بہت سی ہیں بعض کا تذکرہ ہم ذیل میں کرتے ہیں:

* ماضی میں جو جہادی وقتالی معرکے مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے ساتھ ہوئے ہیں اس نے انہیں اب تک خوف میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس لیے وہ کسی دینی تحریک کو ابھرتا ہوا دیکھ کر سخت گھبراہٹ میں ہو جاتے ہیں۔
* وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ مسیحی دین داری اور حکومت وسیاست میں گہرا ربط ہے۔ جس کو یہ بڑی اہمیت دیتے ہیں اس بنا پر آغاز سے ان دشمنوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ دعوت کا کام کرنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور ان کے در پئے آزار ہو جاتے ہیں۔ اس دین کے ماننے والوں کے سامنے اس کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں اور ان پر علمی اور عملی یلغار جب بھی موقع ملتا ہے کرتے رہتے ہیں۔
* ہر شخص خواہ وہ مشرق کا ہو یا مغرب کا اسے معلوم ہے کہ اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد اس کے مفادات کو سخت چوٹ لگے گی اور اس کی تجارتی مصلحتوں کو عظیم نقصان پہنچے گا۔ مثلاً یہ کہ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے اس قول کو يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ اختیار کر لیں تو ہزاروں بنکوں کو تالا لگ جائے۔ اسی طرح اگر وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى پر عمل کر لیں تو ہزاروں کارخانے بند ہو جائیں اور تجارت کی منڈیاں سرد پڑ جائیں۔
* ایک اور مشکل یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اور علماء باہر کی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو بھاری ڈگری تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ علم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے حرج تو صرف ان کی تہذیب کے سانچوں میں ڈھل جانے میں ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس خود ہی وہ تہذیب ہے جسے ہم دوسروں کو دے سکتے ہیں لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ علم کے راستہ سے ہمارے طلبہ کے اندر اپنی بدترین تہذیب کو بھی گھسا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر اس حال میں لوٹتے ہیں کہ بڑی حد تک وہ مغربی بن

چکے ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی امت مسلمہ کی مشکلات میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔

اس طرح ہمارا اور ان مستغربین کا مسئلہ بقول شاعر یوں ہو جاتا ہے:

نَخْذُتُكُمْ دِرْعًا حَصِيْنًا لِتَدْفَعُوْا بِنَا الْعِدَا عَنِّيْ وَكُنْتُمْ نَصَالِهَا

" ہم نے تمہیں ایک محفوظ ڈھال تصور کیا تھا کہ تم دشمنوں سے ہماری حفاظت کرو گے لیکن تم تو نیزے کی انی ثابت ہوئے۔"

دعوت الی اللہ کا کام کرنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد نہیں کیا ہے کہ وہ اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لا کر ہی رہیں گے کیونکہ اس طرح کا دعویٰ کرنا تو کسی ولی اور نبی کے لئے غیر مناسب ہے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمادیا ہے:

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ [النحل:۱۶/۳۷]

" اے نبی! تم چاہے ان کی ہدایت کے لئے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جسے بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت نہیں دیتا اور اس طرح کے لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ [یونس:۱۰/۹۹]

"اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین میں سب مؤمن وفرماں بردار ہی ہوں تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مؤمن ہو جائیں"

وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ وہ ہدایت پانے والوں کو ان کے مقام سے بڑھا نہیں سکتے اور نہ ہی اس بات کا انہیں اختیار ہے کہ وہ ظالموں کو غلبہ پانے سے روک دیں۔ انہیں تو صرف اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ اور بس!!!

بشارتیں:

گھٹاٹوپ تاریکیوں کی اس وادی میں نصرت الٰہی اور امیدوں کی شمعیں جلتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے ایک خوش کن بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں علم کی

ترقی نے لوگوں کے اندر آزادی کی لہر سی دوڑا دی ہے اور ظاہر ہے کہ علم کی ترقی ہی روشنی وہدایت کا پیش خیمہ ہے۔ یہ عقل وفطرت میں پختگی لاتی ہے اور کسی بھی چیز کو دیکھ کر اس کے بارے میں تحقیق و جستجو پر آمادہ کرتی ہے، اس لیے جو دعوت حق کو روکنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں ان کے اثرات ان لوگوں پر ہر گز نہیں پڑ سکیں گے جو سچائی اور نیک نیتی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کر رہے ہیں۔

ایک اور خوش کن بات یہ ہے کہ وہ تہذیبیں جو مادہ کے تقدس کی قائل اور روحانیت کو ڈھکوسلہ قرار دینے والی ہیں ان کو زبردست شکست سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے۔ اور دنیا بھر کے مفکرین ودانشور مادیت کی فکر سے آزاد ہو کر کسی ایسی تہذیب کی تلاش میں ہیں جو انہیں ان کی متاع گم شدہ واپس کر دے۔ اب وہ کسی بھی قیمت پر حیوانی زندگی گزارنے کے لئے رضا مند نہیں ہیں جس میں انسان کو بطن وفرج کا پرستار اور بہری مشین بنا دیا گیا ہو۔ وہ حقیقی معنوں میں انسان بننا چاہتے ہیں اور وہ ہر اس شخص سے افہام و تفہیم کے لئے راضی ہیں جو انہیں صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کر سکے۔ ایسا راستہ جس میں مادیت وروحانیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

ایک اور خوش کن بات بڑی طاقتوں کی آپس کی رسہ کشی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے درمیان سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کمزور طبقہ کے لئے راہ نجات مہیا کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَوْلاَ دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ۔ [البقرہ: ۲۵۱/۲]

" اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)"

سامراجیت کی ناکامی:

سامراجیت کو عربی ممالک اور تمام ممالک اسلامیہ میں سخت پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ ہماری عزت وآزادی ہمیں پھر سے واپس مل رہی ہے اور دشمنوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ تحریک اسلامی کی راہ کا یہ بڑا پتھر تھا جس کے ہٹ جانے

کے بعد ہم آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے۔

کیا ہی بہتر ہوتا اگر ہمارے ملکی حکام اپنے بھائیوں کو قول و عمل کی آزادی دیتے تو اس دن ہمارے بھائی اللہ کی اس مدد سے کس قدر خوش ہوتے۔

حکومتی سطح پر دعوت و تبلیغ کا اہتمام:

بعض اسلامی حکومتوں نے دعوت اسلامی کی نشر واشاعت کے لئے سرکاری سطح پر بھی کام شروع کر دیا ہے ان میں بعض کام یہ ہیں:

اسلامی کتابوں کی طباعت، داعیان دین کی تربیت، ملک کے مختلف حصوں میں دعوت حق کی اشاعت کے لئے وفود روانہ کرنا، عالمی پیمانے پر کانفرنسوں کا انعقاد، اور ایسے اداروں کی تشکیل جو عوامی سطح پر اسلام کی خدمت کر سکیں اور اس کے لئے مالی وسائل وذرائع مہیا کرنا۔ یہ تمام چیزیں ہیں جو ہمارے لئے خوش کن مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔

حرف آخر:

آخر میں یہ نکتہ ہر شخص کو (خواہ وہ کوئی داعی ہو یا عام مسلمان) جان لینا چاہیے کہ دعوت کا کام موٹی موٹی کتابیں پڑھ لینے اور اونچی اونچی ڈگریاں لے لینے سے نیز ذکاوت وخطابت کے اظہار سے انجام نہیں پاتا بلکہ اس کے لئے نفس کو دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے پاک رکھنا پڑتا ہے۔ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور ہر اس چیز کا التزام کرنا پڑتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے پسند کیا ہے، سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے:

وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [التغابن: ۱۱/۶۴]

" اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے، اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔"